ایمرجنسی
صدیق سالک

ایمرجنسی

صدیق سالک

۱۹۹۷ء

- حصہ اول

ایک دفعہ ایک دوست نے انہیں ایک کتا تحفے میں دیا۔ پیارا سا' گول مٹول۔ یہی کوئی پاؤ بھر کا۔ روئی کے گالے کی طرح نرم و نازک۔ بقیہ جسم کی طرح اس کی آنکھیں' کان اور سر بھی لمبے لمبے سفید بالوں میں چھپے ہوئے تھے۔ صرف چمکتی ہوئی ناک اس بات کا پتہ دیتی تھی کہ روئی کے اس گالے میں کوئی کتا چھپا ہوا ہے...... اعلیٰ نسل کا کتا! ملک صاحب نے اسے تحفہ دوست سمجھ کر اس پر اپنی شفقت نچھاور کرنا شروع کردی۔ یہ ننھی سی جان جلد ہی ان سے مانوس ہو گئی۔ ملک صاحب بھی اس کے اللے تللے بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کیا کرتے۔ ٹیری کبھی صوفے پر چڑھ جاتا' کبھی چارپائی پر اور کبھی ان کی گود میں۔ اگر وہ اس کے پیار اور محبت کا فوراً جواب نہ دیتے تو وہ ان کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہو جاتا اور جب تک انہیں منا نہ لیتا' قدموں سے اٹھنے کا نام نہ لیتا۔ ملک صاحب بھی یوں والہانہ اظہار محبت کرتے دیکھ کر اسے گود میں اٹھا لیتے۔ وہ اپنی ننھی سی گردن اکڑا کر' اپنا گلابی منہ اوپر اٹھاتا اور ملک صاحب منہ پر بوسہ دینے کی بجائے پیار سے تھپتھپا دیتے' پچ پچ کرتے اور گیند کی طرح اسے پھر زمین پر لڑھکا دیتے۔ ایک مرتبہ ملک صاحب پر تکلف محفل میں' مہمانوں کے پاس بیٹھے' کسی اہم موضوع پر بڑی سنجیدگی سے بات کر رہے تھے کہ ٹیری آکر ان کے قدموں میں لیٹ گیا۔ ملک صاحب نے اپنے چپل سے پاؤں نکال کر اس کے نرم نرم بالوں پر پھیرا اور مہمانوں سے اپنی گفتگو میں کوئی وقفہ نہ آنے دیا۔ تھوڑی دیر بعد ٹیری رینگتا رینگتا ایک مہمان کے قدموں تک جا پہنچا جو کتوں کے شوقین نہیں تھے۔ انہوں نے کتے

کو نجس سمجھتے ہوئے یا ویسے ہی ڈر کر اپنا پاؤں پیچھے سر کا لیا۔ کتا اشارہ نہ سمجھ سکا اور اظہار محبت کے طور پر اپنی ننھی منی ناک سے ان کے قدموں کو سونگھنے لگا۔ مہمان نے اپنے آپ کو کچھ اور سمیٹا لیکن ٹیری اظہار محبت میں آگے ہی بڑھتا گیا۔ اتنے میں مہمان کے چہرے کا بدلتا رنگ دیکھ کر ملک صاحب نے ٹیری کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ وہ باز نہ آیا تو اسے حکم دیا "گیٹ آوٹ۔" پتہ نہیں انگریزی کتے کی سمجھ میں نہ آئی یا وہ ملک صاحب سے اپنی خصوصی تعلقات کے زعم میں رہا کہ اس نے ملک صاحب کے حکم کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ ملک صاحب نے مہمانوں کے سامنے پاؤ بھر کتے کے ہاتھوں اپنی سبکی ہوتے دیکھی تو غصے میں آگئے۔ انہوں نے ڈانٹتے ہوئے دو مرتبہ کہا "گیٹ آوٹ' آئی سے گیٹ آوٹ" (GET OUT. I SAY GET OUT.) کتے نے تعجب اور بے بسی کے ملے جلے جذبات سے ملک صاحب کی طرف منہ اٹھا کر دیکھا لیکن اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ ملک صاحب کا پارہ اور چڑھ گیا انہوں نے سامنے دیوار پر لٹکی ہوئی بندوقوں' تلواروں اور نیزوں میں سے ایک نیزہ اتارا اور نہایت بے دردی سے ٹیری کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ ٹیری وہیں چیخنے اور تڑپنے لگا۔ ماحول پر خاموشی اور سناٹا چھا گیا۔ مہمان چپ ہوگئے۔ ملک صاحب نے ایک ملازم کو بلایا اور حکم دیا غلاظت کے اس لوتھڑے کو باہر پھینک دو...... کتا ہو یا انسان جو اطاعت نہیں کر سکتا' وہ وفادار نہیں ہوسکتا۔

ملک صاحب کی وسیع و عریض حویلی میں یوں تو کئی انسان اور جانور پل رہے تھے لیکن موٹی کالی بلی ایک عرصے سے وہاں مقیم تھی۔ شائد وہ اپنی نسل کی قدیم ترین مخلوق تھی جو حویلی کے نمک پر پل رہی تھی اور دل و جان سے اس کی وفادار اور خیر خواہ تھی۔ وہ زیادہ سوشل نہ تھی' بس ایک چکر حویلی کا لگاتی جیسے صبح صبح ہر کسی کو سلام کر رہی ہو' پھر مٹی کے مخصوص پیالے میں پڑے ہوئے دودھ کو لپ لپ کرکے پی جاتی اور یوں ناشتے سے فارغ ہو کر مونچھوں پر زبان پھیرتی حویلی کے جنوب مشرقی کونے

میں دبک کر بیٹھ جاتی۔ دوپہر تک وہاں استراحت کرتی' پھر کھانے کے لیے اٹھتی اور جو کچھ مل جاتا' صبر شکر کرکے کھالیتی اور پھر اپنی مخصوص جگہ پر لیٹ جاتی۔ وہ گھر والوں کو تنگ کرتی نہ چھوٹے بڑے جانوروں کے معاملوں میں دخل دیتی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ تارک الدنیا ہے جو اپنا وقت مراقبے اور عبادت میں گذارنا چاہتی ہے۔ جانوروں میں بھی غالباً وہ سب سے زیادہ نیک اور پرہیز گار سمجھی جاتی تھی اور ملک صاحب کے بیٹے اور پوتے اسے احترام سے گرینڈما (GRANDMA) کہتے تھے۔ اتنی حلیم الطبع' خاموش اور نیک بلی پہلے کسی نے نہیں دیکھی تھی۔

اس بلی میں ایک ہی نقص تھا کہ جب حویلی میں کوئی ناجائز بات یا ظلم ہوتے دیکھتی تو مہر سکوت توڑ کر فریاد ضرور کرتی۔ کبھی دھیمی آواز میں اور کبھی چیخ چیخ کر پتہ نہیں شاید یہ بلی اپنے پیٹ کے درد یا بھوک اور پیاس کی وجہ سے بلبلاتی ہو لیکن وہاں کے باشندوں خصوصاً نوکروں کا خیال تھا کہ یہ ناپسندیدہ کاموں پر صدائے احتجاج بلند کرتی ہے اور وہاں کے بسنے والوں کو مکافات عمل سے خبردار کرتی رہتی ہے۔ پچھلی سردیوں میں ملک صاحب نے اپنے گھریلو ملازم "نصیبے" کو اس کی کسی غلطی پر ہنٹروں سے مار مار کر بیہوش کر دیا تھا۔ پھر پرانی اور کمزور گھوڑی کو قید حیات سے آزاد کرانے کے لئے اسے کھڑے کھڑے گولی مروا دی تھی اور سورج کی شعاؤں کی خاطر صحن میں لگے ہوئے شیشم کے خاندانی درخت کٹوا دیئے تھے تو یہ بلی بہت چیخی تھی۔ بار بار چیخی تھی' پتہ نہیں اپنی فریاد ملک صاحب کو سنانا چاہتی تھی یا محض اتفاق تھا کہ جونہی ملک صاحب حویلی میں داخل ہوتے یہ کالی بوڑھی بلی آسمان سر پر اٹھا لیتی۔ ملک صاحب نے تنگ آکر اپنے ملازم کو حکم دیا کہ اس گستاخ بلی کو حویلی سے نکال دے۔ اس نے حکم کی تعمیل میں بلی پر ڈنڈے برسانے شروع کئے اور وہی بلی جو حویلی کے جنوب مشرقی گوشے کو کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہ تھی حویلی کے پچھلے پھاٹک سے باہر نکل گئی۔ ملازم نے کھٹ سے گیٹ بند کر دیا اور کنڈی چڑھا دی۔ لیکن حویلی کے مالک اور ملازم

اگلے روز صبح کو جاگے تو بلی واپس آچکی تھی۔ اب ملک صاحب کو یہ بلی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اس کی بلا دعوت واپسی کو اس کی وفاداری پر محمول کرنے کی بجائے انہوں نے اسے ڈھیٹ پن سے تعبیر کیا اور دوسرے ملازم کو تاکید کی کہ اب اس بلی کو حویلی بدر کرنے کی بجائے باہر جنگل میں پھینکا جائے۔ حکم کی تعمیل کی گئی لیکن احتجاج کرنے والی وفادار بلی تیسرے روز پھر آدھمکی۔ اب ملک صاحب نے اسے دریا میں پھنکوایا جو بارشیں نہ ہونے کی وجہ سے نیم خشک تھا۔ چوتھے روز وفادار بلی پھر حویلی میں واپس پہنچ گئی۔ بالاخر ملک صاحب نے اپنی آنکھوں کے سامنے اسے مروا دیا۔ ڈھیٹ کہیں کی!

ملک صاحب کو اپنی پہلی بیوی سے بہت پیار تھا۔ ذکیہ نام تھا اس کا' لیکن پیار سے اسے ذکو کہا کرتے۔ بڑے ناز اٹھاتے تھے اس کے' زیوروں سے لاد رکھا تھا اسے۔ ایک دفعہ سردیوں کی رات کو چند مہمانوں کے اعزاز میں ڈنر دیا گیا۔ عورتیں اور مرد خوب بن ٹھن کر آئے تھے۔ کپڑوں کے علاوہ جیولری اور پرفیوم کا بھی خوب مقابلہ ہوا۔ ذکیہ بھی ملک صاحب کی خواہش کے مطابق خوب بنی ٹھنی ہوئی تھی۔ اس نے قیمتی سے قیمتی زیورات پہن رکھے تھے۔ ڈنر خوشی خوشی گذرا۔ مہمانوں نے کھانا بھی جی بھر کر کھایا اور گپ شپ بھی خوب رہی۔ کوئی گیارہ بجے کے بعد جب مہمان چلے گئے تو گھر والے آگ کے پاس بیٹھ گئے۔ سب خوش و خرم تھے۔ باہمی داد و تحسین کا دور ختم ہوا تو ذکیہ اور ملک کے چھوٹے بیٹے ضمیر کی شادی کی بات چھڑ گئی۔ ملک صاحب نے کہا اس کی شادی تو پرویز اور قدیر سے زیادہ دھوم دھام سے کریں گے۔ سارا مال امپورٹڈ ہو گا' جیولری' کپڑے' سامان وغیرہ! ملک صاحب کو موڈ میں دیکھ کر ذکیہ نے مصنوعی ناراضی سے کہا ہاں جس پرانی یا نئی بہو کو جو چاہو' خرید دو اور اپنی بیوی کی فکر نہ کرو۔ کیا مجال جو پچھلے چھ مہینوں میں ایک بار بھی بیرون ملک شاپنگ کے لئے بھیجا ہو یا جھوٹے منہ میری ضرورت کے متعلق کبھی پوچھ لیا ہو۔ میں تو پچھلے دو سال سے ایک ہی ڈیزائن

کے زیور پہن پہن کر تنگ آچکی ہوں فیشن کہیں کا کہیں جا چکا ہے اور میں پرانے گراموفون کی سوئی کی طرح ایک ہی جگہ پھنسی ہوئی ہوں۔ ملک صاحب اتنی سی بات پر طیش میں آگئے۔ انہوں نے مغلیہ وضع کے فرشی حقے کی سنہری تاروں والی نال ایک طرف پھینکی اور وہیں دیکھتے ہی دیکھتے بلکہ دوسروں کے منع کرتے کرتے ذکیہ کے تمام زیور اتروا لئے اور اپنے ہاتھوں سے جلتی آگ میں پھینک دیئے۔

"میرے ساتھ تو میرے سسر (ملک صاحب) کا رویہ سگے باپ سے بھی زیادہ مشفقانہ ہے۔ جب سے میں اس گھر میں بہو بن کر آئی ہوں' میری ہر ضرورت بن مانگے' بڑی رضا و رغبت سے پوری کی گئی۔ میں گہنوں کی شوقین نہیں لیکن شادی کی سالگرہ پر انہوں نے پرلز کا نیا سیٹ سنگاپور سے منگوا کر دیا۔ پچھلی سالگرہ پر انہوں نے ہماری کار بدلوا دی' حالانکہ اس کا ماڈل صرف دو سال پرانا تھا اور پھر انہی گرمیوں میں انہوں نے مجھے شاپنگ کے لیے زبردستی بازہ' بھیجا اور اصرار سے کہا کہ دیکھو بلی' اگر شاپنگ کا بل بیس ہزار روپے سے کم ہوا تو گھر میں گھسنے نہیں دوں گا۔ پرویز کی پروا نہ کرنا' وہ کچھ کنجوس واقع ہوا ہے۔ شاپنگ کا بل میں دوں گا۔ اور بل واقعی انہوں نے ادا کیا"

"میں ان کا پرانا ملازم ہوں۔ میرے والد صاحب بھی انہی کے ہاں ملازم رہے۔ ہم نے تو ملک صاحب کو اول درجے کا فیاض' مہربان اور غریب پرور پایا ہے۔ خاندانی آدمی ہیں' چھوٹوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ہمارا تو رواں رواں ان کے احسانات میں جکڑا ہوا ہے۔ ذرا طبیعت سخت اور غصے کے تیز ہیں لیکن دل کے نرم اور سخی ہیں۔ میری ماں ٹی بی کی مریضہ تھی' اس کا علاج انہوں نے کروایا' میری شادی انہوں نے کروائی۔ میرے والد کی تجہیز و تکفین کا سارا خرچ انہوں نے برداشت کیا۔ ان کی عنایات مجھ تک یا میرے اہل خاندان تک محدود نہیں وہ تو سب کے لئے فرشتہ رحمت ہیں۔ شفیق' سخی' غریب نواز! ہم نے تو ان سے بڑا اور عظیم انسان نہیں دیکھا"

"میں ملک صاحب کا مالی ہوں' بارہ مالیوں میں سے ایک' لیکن دس مالیوں سے سینئر ہوں۔

پتہ نہیں لوگ ان کے متعلق کیا کہتے ہوں گے لیکن میں نے تو انہیں پودوں' پھولوں اور پھلوں کا عاشق پایا ہے۔ انہوں نے اپنے فارم پر بڑے شوق سے گرین ہاؤس بنوا رکھا ہے جہاں نازک پودوں کے آرام کے لئے انہوں نے ہیٹر لگوار رکھے ہیں۔ بجلی فیل ہو جائے تو کڑاکے کی سردی میں انگیٹھیاں جلوا کر بھیج دیتے ہیں۔ گلاب میں تو ان کی جان ہے۔ اب تک انہوں نے ۲۷۸ قسمیں جمع کر رکھی ہیں' اور کہتے ہیں پانچ سو پوری کرنی ہیں۔ وہ ہر روز نہیں تو دوسرے یا تیسرے' نرسری کا چکر ضرور لگاتے ہیں۔ خاص خاص پودوں کے سر پر جا کھڑے ہوتے ہیں۔ کالے گلاب کے پاس تو وہ پاؤں کے بل بیٹھ کر اس کی کلیاں گنتے ہیں اور پھولوں اور پودوں کو بڑھتا' اور پھوٹتا دیکھ کر خوش ہوتے ہیں کہتے ہیں میری بلڈپریشر کی آدھی بیماری تو گلاب کی کھلی ہوئی کیاری دیکھ کر دور ہو جاتی ہیں لیکن صاحب! کیا بتاؤں' ایک دفعہ ان کے پسندیدہ گلاب کی کیاری سے ان کی موجودگی میں سانپ نکل آیا۔ ہم سب ڈنڈا لاؤ' ڈنڈا لاؤ' چیختے ہوئے لپکے تو اتنے میں سانپ ایک بل میں گھس گیا۔ ملک صاحب نے اپنی آنکھوں کے سامنے اس بل کو کھدوایا' سانپ کو تلاش کرا کے اپنے سامنے مروا یا اور پھر وہ ساری کیاری اکھڑوادی جس میں سانپ نے پرورش پائی تھی۔ کیاری آج تک ویران پڑی ہے۔ ملک صاحب خار دار پودوں' قد آور درختوں اور سانپ پالنے والی کیاریوں کو بالکل برداشت نہیں کرتے۔"

یہ وہ چیدہ چیدہ آراء تھیں جو میں نے ۱۹۶۴ء میں شانتی نگر کے سب سے بڑے اور اکلوتے جاگیردار ملک جابر علی خان کے متعلق جمع کیں۔ ملک صاحب کا خاندان سالہا سال سے اس چھوٹے سے نگر پر حکومت کرتا چلا آ رہا تھا۔ ملک جابر علی ولد ملک وجاہت علی ولد ملک شجاعت علی ولد ملک ہیبت علی کا شجرہ نسب پچھلی چھ سات پشتوں تک بڑا واضح اور شاندار تھا لیکن اس سے اوپر ان کے آباو اجداد کا صحیح کھوج نہیں ملتا تھا۔ ان کے مخالفین کا کہنا تھا اس سے پہلے ملک صاحب کا خاندان دوسرے دیہاتیوں کی طرح ایک

عام سا خاندان تھا اور پہلی مرتبہ انگریزوں کے دور میں جب انہیں شانتی نگر میں جاگیر الاٹ ہوئی تو انہوں نے نام پیدا کرنا شروع کیا۔ بعد ازاں نسل در نسل انگریز ڈپٹی کمشنروں اور پولیس کپتانوں سے ذاتی تعلقات کی آڑ میں انہوں نے اہل دیہہ کی زمینوں پر اونے پونے قبضہ کرنا شروع کیا جس کے نتیجے میں ملک صاحب کی جاگیر پھیلتی اور عام دیہاتیوں کی زمین سکڑتی گئی حتیٰ کہ ملک صاحب شانتی نگر کے سب سے بڑے لینڈ لارڈ بن گئے۔

ملک جابر علی اس پرانے خاندانی پس منظر پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ کہانی سنایا کرتے تھے کہ ان کے آباء و اجداد احمد شاہ ابدالی کے ساتھ برصغیر میں فاتحین کے طور پر داخل ہوئے اور دوسرے کئی فاتحین کی طرح یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ پہلے دور میں ان کے بزرگ دہلی میں آباد تھے پھر جب آل اولاد بڑھی تو ایک بیٹا ملک دلاور علی ابدالی شانتی نگر میں آکر بس گیا جس کے ہاں پہلا بیٹا ملک ہیبت علی پیدا ہوا اور وہی اپنے والد کی وفات کے بعد ان کی جاگیر اور جائیداد کا وارث ٹھہرا۔

لیکن اب گاؤں والے ملک صاحب کی پھیلائی ہوئی داستان پر یقین نہیں کرتے تھے اور یہی سمجھتے تھے کہ ان کے بزرگوں نے انگریزوں کی خدمت کی جس کے عوض انہیں جاگیر عطا ہوئی اور بس اس میں خاندانی جاہ و حشمت کا کوئی دخل نہیں' خدمت و ایثار کا صلہ ہے جو وہ کھا رہے ہیں اور انگریزوں کے چلے جانے کے بعد اقتدار کی مختلف سطحوں پر جو خلا پیدا ہو گیا تھا' اسے مقامی سطح پر پر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ملک جابر علی خان خود جوانی کی دہلیز پار کرکے ادھیڑ عمر میں داخل ہو چکے تھے ان کی پہلی شادی اوائل عمری میں ہو گئی تھی اور انہوں نے اپنے تین بیٹوں پرویز علی خان' قدیر علی خان اور شعیب علی خان کی شادیاں بھی ان کے کالج چھوڑنے کے فوراً بعد کر دی تھیں سب سے چھوٹا لڑکا ضمیر علی خان ذرا مختلف واقع ہوا تھا۔ اس نے شادی سے دو ٹوک انکار کر دیا تھا اور وہ آج تک مجرد چلا آرہا تھا (اس کی تفصیل آگے آئیگی)

ملک جابر علی خان ابدالی (جنہوں نے ابدالی کا لقب پچھلی دو پشتوں سے کم کر دیا تھا)

ایک قد آور اور وجیہہ شخص تھے۔ ان کے جسم کی ساخت اور چلنے پھرنے کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ ان میں نہ صرف خاندانی رعونت کا عنصر موجود ہے بلکہ وہ خود بھی مردانہ مشاغل مثلاً گھڑ سواری، پولو، شکار، تیراکی اور کوہ پیمائی وغیرہ میں دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ وہ اپنی عمر سے کوئی دس سال کم لگتے تھے اور ان کی بزرگی کی واحد علامت کنپٹی کے سفید بال تھے۔ وہ اپنی عمر سے کوئی دس سال کم لگتے تھے اور ان کی بزرگی کی واحد علامت کنپٹی کے سفید بال تھے۔ وہ داڑھی حجام سے خوب رگڑوا کر صاف کراتے تھے اور اس باقاعدگی سے کہ داڑھی کا ایک بال بھی سطح جلد پر نظر نہیں آتا تھا۔ ان کی بھاری اور گھنی مونچھوں کے زیادہ تر بال قدرتی طور پر سیاہ تھے اور جب کبھی کوئی اکا دکا سفید بال سر اٹھاتا تو حجام موچنے سے اکھاڑ پھینکتا تھا بلکہ حجام کو ایسے ناپسندیدہ بالوں کو باہر نکال پھینکنے میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ وہ عموماً صبح صبح ملک صاحب کی حجامت کرنے کے بعد ان کے چہرے کا نچلا حصہ اپنے بائیں ہاتھ کے پیالے میں سجا کر دائیں ہاتھ سے، موچنے کی مدد سے سفید بال چننے لگتا اور ہر بار موچنے کو اس انداز اور تواتر سے حرکت دیتا کہ اس میں ایک ردم (RHYTHM) پیدا ہو جاتا، پھر اس نے موچنے کے دستے کے ساتھ چاندی کے دو ننھے منے گھنگھرو باندھ لئے تھے جن سے ردم میں اور زیادہ موسیقیت آ جاتی تھی اور ملک صاحب بڑے آرام سے اپنا چہرہ حجام کے سپرد کرکے یہ میوزک سنتے رہتے تھے۔ تین چار منٹ میں وہ اپنا کام مکمل کر لیتا اور ملک صاحب چھوٹے سے سفید تولیے سے ناک منہ جھاڑ کر شیشہ دیکھتے اور حجام کو فارغ کر کے باتھ روم میں چلے جاتے۔

ملک صاحب گھر میں عموماً شلوار قمیض پر ہاف کوٹ پہنتے اور سردیوں میں گلے کو بند رکھنے کے لیے مفلر کی جگہ ٹائی باندھتے۔ گرمیوں میں باہر نکلتے تو ان کے نیم گنجے سر پر سولا ہیٹ یا آگے سے جھکی ہوئی گاف کیپ یا ہنٹنگ کیپ (HUNTING CAP) ہوتی لیکن وہ شلوار کرتے میں بہت کم حویلی سے باہر قدم رکھتے تھے۔ اگر انہیں شہر جانا ہوتا

یا کسی افسر سے ملاقات کرنا ہوتی تو تھری پیس سوٹ اور فیلٹ ہیٹ پہن کر جاتے' اگر کسی جاگیردار کے ہاں تشریف لے جاتے تو اکڑے ہوئے طرے کے ساتھ گہرے رنگ کی اچکن پہنتے جس کے سامنے کے ساتوں کے سات بٹن گلے تک بند ہوتے۔ زمینوں پر چکر لگاتے تو پتلون کے ساتھ چیک کوٹ پہنتے جس کی کہنیوں پر چمڑا منڈھا ہوا تھا۔ شام کی گھوڑے پر چڑھ کر شکار کھیلنے جاتے تو عموماً اسی چیک کوٹ کے ساتھ براؤن رنگ کی برجس' لانگ بوٹ اور ہنٹنگ کیپ میں اپنے آپ کو کس لیتے۔ وہ جہاں بھی جاتے ڈنڈا' چھڑی یا واکنگ سٹک ضرور ہاتھ میں رکھتے۔ مجموعی طور پر ان کی شخصیت خاصی بارعب تھی۔ مونچھوں کی اٹھان' ان کی اپنی چال ڈھال اور ان کے بولنے کا انداز صاف بتاتا تھا کہ یہ شخص خدمت کے لیے نہیں' حکمرانی کے لیے پیدا ہوا ہے اور حکمرانی آج سے اس کے حصے میں نہیں آئی بلکہ پشت ہا پشت سے ان کا یہی شعار چلا آرہا ہے۔

جو لوگ ملک صاحب کو قریب سے جانتے تھے۔ وہ ان کی بہت سی ذاتی خوبیوں کے معترف تھے۔ وسیع القلب' نرم دل' غریب پرور اور سچے حکمران! گاؤں کے اکثر لوگ جو انہیں صرف فاصلے سے دیکھتے تھے انہیں حاکمانہ ذہنیت کا قابل نفرت شخص سمجھتے تھے جو اپنے آباد اجداد کی غلامانہ حرکتوں کی وجہ سے آج حاکم بنے پھرتے تھے لیکن ان کے سامنے کسی کو بولنے یا پیٹھ پیچھے ان کی برائی کرنے کی ہمت نہ تھی کیونکہ ان کی شہرت یہ تھی کہ وہ تنقید کو قطعاً پسند نہیں کرتے۔ اپنے حریفوں کو اغوا یا قتل کروا دیتے ہیں اور اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لیے ہر چیز کو قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں۔

شاید یہی وجہ تھی کہ شانتی نگر میں قبرستان جیسی "شانتی" قائم تھی۔

شانتی نگر دو واضح حصوں میں منقسم تھا۔ ایک حصے میں گاؤں کے عوام بستے تھے اور دوسرے میں ملک صاحب کی حویلی قائم تھی' دونوں کے درمیان حد فاصل ایک سڑک نما کھلی

مگر کچی گلی تھی جسے پار کرنا کسی دیہاتی کے بس میں نہ تھا۔ حویلی کے کلس بہت اونچے اور گاؤں کے مکان بہت نیچے تھے۔ ایک طرف فراز تھا اور دوسری طرف نشیب' اور سالہا سال سے یہی نشیب و فراز شانتی نگر کا مقدر بن چکے تھے۔

اس حویلی سے ذاتی طور پر میرا تعارف اس وقت ہوا جب میں تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ ماسٹر اللہ دتہ ہمیں پڑھاتے تھے اور پڑھنے سے زیادہ تختی لکھنے پر زور دیتے تھے۔ جس روز "گاچی" لگی تختی تیار نہ ہوتی۔ "کانے" کا قلم ترشا ہوا نہ ہوتا یا دوات میں صوف نہ ہوتا' اس دن وہ' سردی ہو یا گرمی...... بائیں ہاتھ پر تین بید ضرور برساتے اور سزا دیتے وقت دائیں ہاتھ کی بچت کر جاتے تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ شاید وہ دائیں ہاتھ پر بید اس لئے نہیں مارتے کہ یہ ہاتھ تختی لکھنے سے انکار نہ کر دے' لیکن ان کا فلسفہ یہ تھا کہ دائیں ہاتھ سے خیر کے کاموں کی توقع کی جاتی ہے۔ اس ہاتھ سے وضو کرتے ہیں' اسی سے شہادت دیتے ہیں اور منصف' جج اور حاکم اسی ہاتھ سے اہم فیصلے لکھتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق بائیں ہاتھ کو سزا ملنے سے دایاں ہاتھ خود بخود سمجھ جاتا ہے اور غلطی کرنے سے گریز کرتا ہے۔

لیکن یہ تو بعد کی باتیں ہیں' اس وقت تو ہمیں اسی بات کی فکر لاحق رہتی تھی کہ تختی' قلم اور دوات ٹھیک ہونی چاہیے۔ تختی کے لیے گاچی اور قلم کے لیے کلک آسانی سے مل جاتی تھی لیکن صوف میں ڈالنے کو "سیاہی" باآسانی نہیں ملتی تھی۔ گاؤں کی دکان پر سیاہی کی ایک پڑیا ایک پیسے میں ملتی تھی لیکن ان دنوں پیسہ ہر کسی کو دستیاب نہیں ہوتا تھا۔ گھر والے بڑی مشکل سے ہفتے میں ایک پڑیا خریدنے کے لیے پیسے دیتے تھے' اور اگر تازہ سیاہی اور تازہ صوف ڈالنے کے بعد دوات الٹ جاتی تو پٹائی ہوتی تھی کہ پورے ایک پیسے کی سیاہی ضائع کر دی' بلکہ والدہ صاحبہ' جو اکثر اپنے کپڑے خود گھر پر رنگا کرتی تھیں' سکول جانے والے بچوں کو مشورہ دیا کرتی تھیں کہ دوات میں آئے روز صوف کے طور پر کپڑے کا نیا ٹکڑا نہ ڈالا کرو' نیا کپڑا زیادہ رنگ چوستا ہے۔ اگر

صوف پرانا پڑا رہے اور اس پر تھوڑی سی سیاہی...... یعنی آدھی یا چوتھائی پڑیا...... ڈال دی جائے اور مناسب مقدار میں پانی ڈال کر اسے گھول لیا جائے تو کام چل سکتا ہے۔ لیکن ہمیں ان دنوں اپنی غربت کے باوجود کفایت کے یہ طریقے نہیں آتے تھے۔

ہم نے اس کا علاج یہ ڈھونڈا تھا کہ سیاہی خود گھر پر تیار کرتے تھے جس کے لیے تین اجزا کی ضرورت ہوتی تھی۔ توے کی کالک' گوند اور باداموں کے چھلکے! ہم گوند اور باداموں کو چلا کر پیس لیتے تھے اور توے کی کالک میں ملا کر خشک سیاہی تیار کر لیتے تھے کالک ویسے ہی گاؤں میں بہت تھی! گوند بھی ہم درختوں پر چڑھ کر کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ لاتے تھے' البتہ بادام کے چھلکے آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے تھے۔ جن لوگوں کو روٹی کے خشک ٹکڑوں کی فکر ہر وقت دامن گیر رہتی ہو وہ بادام کیسے استعمال کر سکتے تھے' الا یہ کہ کسی شخص کو حکیم صاحب نے دوا کے طور پر کسی چیز میں بادام ملا کر کھانے کی ہدایت کی ہو۔ لیکن اسے ہماری بدقسمتی کہئے کہ جب ہمیں باداموں کے چھلکوں کی ضرورت پڑتی' گاؤں میں بادام کھانے والا کوئی مریض موجود نہ ہوتا۔ ہم بھاگے بھاگے حکیم صاحب کی دکان پر جاتے کہ شاید کہیں ٹوٹے پھوٹے دو چار بادام مل جائیں لیکن کہیں نہ ملتے۔ حکیم صاحب سے مانگتے تو وہ کہتے چونی لاؤ تو بادام دوں گا۔ ہمارے پاس چونی ہوتی تو ہم یوں دربدر ٹھوکریں کیوں کھاتے۔

شام تک میری سیاہی کا بندوبست نہ ہو سکا تو میں نے والد صاحب سے بچتے ہوئے' والدہ صاحبہ سے کہا کہ ایک پیسہ دیدیں میں سیاہی کی پڑیا لے آؤں ورنہ اگلی صبح تین بید کھانا پڑیں گے۔ انہوں نے شفقت مادری کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بہادر شاہی حکم سنایا "ٹھیک ہے کل تین بید کھا لینا' بید کھانے سے کونسا تمہارا قد چھوٹا ہو جائے گا۔ میرے پاس سیاہی کے لئے پیسہ ویسہ نہیں ہے۔ ہر دوسرے دن اماں پیسہ اماں پیسہ۔ میں نے گھر میں سونے کی کان لگا رکھی ہے کیا' جہاں سے تجھے روز پیسے نکال کر دیتی رہوں ہم سے نہیں برداشت ہوتا یہ روز روز کا خرچ! اگر بید کا اتنا ہی ڈر ہے تو چھوڑ دے

سکول جانا۔ تیرے جتنے لڑکے تو دن بھر ڈنگر چرا لاتے ہیں اور شام کو چولہا گرم کرنے کے لیے سوکھے کانٹے بھی لے آتے ہیں' اور تو نکما ایسا ہمارے پلے پڑا ہے کہ صبح تازہ روٹی کھا کر سارا دن سکول ضائع کر دیتا ہے اور شام کو الٹا پیسے مانگتا ہے۔ نکما نکھٹو کہیں کا۔ باپ بھی نہیں سمجھاتا اس نالائق کو! یہ پڑھ کر کیا بابو بن جائیگا؟ کرسی مل جائیگی اسے؟ یہیں "کھجل" ہونا ہے اس نے بھی باپ کی طرح۔ خواہ مخواہ پیسہ اور وقت ضائع کر رہا ہے۔"

یہ طویل جھاڑ کھا کر میں اپنے دوست اور ہم جماعت قادرے (غلام قادر) کے پاس گیا کہ اس مسئلے کا اس سے حل پوچھوں لیکن وہ مجھے گھر پر نہ ملا' البتہ واپسی پر شیکو (شفیق الرحمان) سے اچانک ملاقات ہو گئی۔ اسے اپنا مسئلہ بتایا تو اس نے فوراً حل پیش کر دیا۔ اس نے بتایا کہ حویلی میں ملک صاحب کی بیگم صاحبہ یا ان کے گھر کا کوئی اور فرد روزانہ بادام استعمال کرتا ہے' اور بادام کے ڈھیروں کھوپڑ اگلے روز صبح ہی صبح روڑی پر پھینک دیئے جاتے ہیں' جتنے چاہو اٹھا لینا۔ میں اس انکشاف پر خوش ہونے کی بجائے چپ ہو گیا شیکو نے کہا "کیوں کیا بات ہے' میری اطلاع پر یقین نہیں آیا کیا؟"

"یقین تو ہے......."

"پھر"

"بس کچھ نہیں' حویلی کے قریب جاتے ہوئے اگر ملک صاحب یا ان کے گھر والوں نے دیکھ لیا تو وہ مجھے ماریں گے کہ گاؤں کا لڑکا ان کی حویلی کے قریب کیسے آ گیا۔ پتہ ہے کچھ مہینے پہلے قمر الدین کو ملک صاحب نے پیغام بھیجا تھا کہ اپنے لڑکوں کو سنبھال کر رکھے' جو ادھر آیا اس کی ٹانگیں توڑ دیں گے!"

"نہیں تم غلط سمجھے ہو' وہ دوسری بات تھی وہ تو گاؤں کے آٹھ دس مشٹنڈے ان کے کینو کے باغ میں گھس گئے تھے اور کچے کینو توڑ رہے تھے کہ اوپر سے مالی آگیا۔ اس نے ملک صاحب سے شکایت کی' اور انہوں نے گاؤں والوں کو پیغام بھیج دیا۔ تمہیں

بادام کے چھلکے لینے سے کوئی نہیں روکے گا صبح صبح جانا فجر کی اذان کے فوراً بعد' اس وقت وہ سب سوئے ہوتے ہیں۔"

"اتنی صبح وہاں بادام کے چھلکے کون پھینکے گا؟"

"مجھے نہیں پتہ اتنی لمبی چوڑی باتوں کا۔ اگر تازہ چھلکے نہ سہی تو مٹھی دو مٹھی چھلکے تو کل والے ہی مل جائیں گے۔ تم تین بیدوں کی سزا سے بچ جاؤ گے۔ آگے تمہاری مرضی۔"

میں رات کو اس فکر میں نہ سو سکا کہ سوتے سوتے سورج نکل آیا اور بادام کے چھلکوں تک نہ پہنچ سکا تو ماسٹر اللہ دتہ میری مرمت کردیں گے۔ لہٰذا میں رات کو کئی بار سویا اور کئی بار جاگا۔ آخر کار صبح کی اذان ہوئی میں اپنے پھٹے ہوئے لحاف میں ٹھوڑی کو گھٹنوں سے ملا کر لیٹا ہوا تھا۔ نماز کے بلاوے پر گرم لحاف چھوڑنے کو جی نہ چاہا اور وہیں لیٹا رہا لیکن جب نماز ہو چکی اور گلی میں نمازیوں کے جوتوں کی آواز آئی تو میں ایک جست میں بستر سے نکلا اور سیدھا روڑی پر پہنچا جہاں شیکو نے بادام کے چھلکوں کی نشاندہی کی تھی۔ وہاں واقعی سیر دو سیر چھلکے پڑے تھے۔ میں نے کرتے کا ڈب جلدی جلدی بھرا ادھر ادھر دیکھا اور کامیاب چوری کے نشے میں حویلی اور گاؤں کی حد فاصل پار کرکے اپنے علاقے میں صحیح سلامت واپس پہنچ گیا۔

میں جب گھر میں داخل ہوا تو ماں چولہے میں آگ جلا رہی تھی۔ صبح صبح اباجی کو حقہ بھر کر دینا ان کی شادی شدہ زندگی کا روز مرہ کا معمول تھا۔ والدہ نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

"تو مارا جائیگا کسی دن حرام موت! یہ صبح صبح کس کی چوری کر لایا اور کیا لے آیا تو؟"

میں نے چولہے کے ایک نکڑ میں اپنا خزانہ انڈیلا تو ماں نے خوش ہونے کی بجائے حوصلہ شکن انداز میں کہا۔

"نکمے کے نکمے ہی رہے تم! چوری بھی کی تو کھوپڑوں کی' کوئی کام کی چیز لاتا تو میں بھی خوش ہوتی کہ آج میرے بیٹے نے کچھ کام کیا ہے۔ لایا بھی تو کھوپڑ!"

والدہ صاحبہ مجھے نہار منہ جھاڑ پلا کر اندر گئی تو میں نے بجھی ہوئی آگ میں بادام کے چھلکے پھینکے۔ وہ اچھی طرح جل کر کوئلہ ہو گئے تو میں نے ہاتھوں کی ننگی انگلیوں سے انہیں دھکیل کر باہر نکالا۔ پھر گوند بھونی' پھر دونوں کو مرچیں کوٹنے والی لنگری میں ڈال کر پیسا۔ پاس ہی پڑے ہوئے توے کی پشت سے سیاہی کریدی اور تینوں کو مناسب مقدار میں ملا کر دوات میں ڈالا دوات میں قطرہ قطرہ پانی ٹپکایا کہ صوف کہیں پھیکا نہ رہ جائے پھر قلم سے "ڈوبا" لگا کر اپنی ہتھیلی پر اسے ٹیسٹ کیا' اور یوں سکول جانے کے قابل ہوا۔

اس حویلی سے میرا دوسرا تعلق اس وقت پیدا ہوا جب ایک دن میں' شیکو اور قادرا سکول سے واپسی پر گاؤں کے جوہڑ پر تختی دھونے کے لیے رکے اور وہاں کاپیوں سے ورق پھاڑ پھاڑ کر کاغذی کشتیاں بنانے لگے اور باری باری انہیں پانی میں ڈالنے لگے۔ آپس میں ہماری یہ شرط بندھی تھی کہ کس کی کشتی ڈوبنے سے پہلے زیادہ دور جاتی ہے۔ پہلے شیکو نے کشتی ڈالی' پھر قادرے نے اور پھر میں نے۔ شیکو کی کشتی پیچھے رہ گئی تو اس نے ہار سے بچنے کے لیے ایک پتھر پانی میں پھینکا تاکہ اس کے ارتعاش کے زور پر اس کی کشتی بھی آگے نکل جائے۔ ہم نے "دغابازی' دغابازی" کا نعرہ لگایا لیکن اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ پتھر شیکو کی کشتی کے بالکل قریب اس زور سے گرا کہ وہ وہیں الٹ کر رہ گئی اور ہماری کشتیاں جو ذرا فاصلے پر تھیں' ارتعاش سے اور آگے بڑھ گئیں۔ ہم اسی شغل میں محو تھے کہ کسی نے ہمارے روڑے سروں پر ایک ایک ڈنڈا برسا دیا۔ اس بن بلائی آفت سے ہم چونکے' مڑ کر دیکھا تو ملک صاحب کا نوکر احمد خان نظر آیا جو ریڑھے پر مالٹے لادے گذر رہا تھا' اور یونہی یکجا تین ننگے سر دیکھ کر اس نے تفریحاً ہم پر ایک ایک ڈنڈا برسا دیا تھا۔ جب ہم نے خشم آلود نگاہوں سے اس ظالم کی طرف دیکھا تو وہ میلی سی بتیسی نکال کر خوب ہنسا اور ہا' ہا کرتا آگے نکل گیا۔ ہم اپنے سروں کو سہلانے لگے۔ قادرے کے سر پر تو اچھا خاصا گومڑ ہو گیا

لیکن ہم نے گھر والوں سے شکایت نہ کی کیونکہ ہمیں پتہ تھا کہ گاؤں والے ملک جابر علی خان اور ان کے نوکروں کے آگے بے بس ہیں۔

بڑی متضاد سی بات لگتی ہے' لیکن ہے یہ حقیقت کہ حویلی سے تیسری بار بالواسطہ طور پر میرا تعلق اس وقت پیدا ہوا جب ملک صاحب گاؤں والوں سے اپنا آخری تعلق بھی توڑ رہے تھے۔ بات یہ تھی کہ حویلی اور گاؤں والوں کا قبرستان مشترکہ تھا یعنی جہاں ملک صاحب کی زمینیں ختم ہوتی تھیں اور گاؤں والے کے پتلے پتلے ویران کھیت شروع ہوتے تھے' وہاں کوئی چار کنال کے رقبے میں قبرستان آباد تھا جس میں دونوں طرف سے مردے دفن کئے جاتے تھے۔ مردے تقریباً ایک ہی طریقے سے ایک ہی زمین میں دفن ہوتے تھے لیکن بعد ان کی قبریں بالکل الگ ہو جاتی تھیں۔ حویلی والوں کی قبریں سنگ مرمر کی بنی ہوتی تھیں' سرہانے بہت بڑی سل پر مرنے والے کا نام لقب' عہدہ اور تاریخ پیدائش و تاریخ وفات وغیرہ درج ہوتی تھی اور لوح مزار تیار کرنے والے کی صوابدید اور شعری ذوق کے مطابق اس کے اوپر ایک شعر یا قطعہ بھی درج ہوتا تھا۔

کئی ایک قبروں کی لوح کے ساتھ اگر بتی یا چراغ جلانے کے لیے بھی جگہ مخصوص تھی جہاں چراغ جلائے جاتے تھے' وہاں چراغ کی لو سے سنگ مرمر کی تختی پر ہلکی سی سیاہی جم گئی تھی لیکن اب ایک عرصے سے یہ پر شکوہ قبریں بھی ویران چلی آرہی تھیں کیونکہ حویلی والوں نے پچھلے کئی برسوں سے اپنے مردے عوام کیساتھ دفن کرنا چھوڑ دیئے تھے اب وہ قبروں کے بارے میں بھی خود کفیل ہو گئے تھے اور اپنے مردے حویلی کی چار دیواری کے اندر ہی ایک کونے میں دفن کرتے تھے۔

قبرستان میں عوام کی قبریں اسی کسمپرسی کے عالم میں تھیں جس میں ان کے مکینوں نے زندگی بسر کی تھی وہ کچی قبریں تھیں جن میں سے بہت سی دھنس کر زمین کے برابر ہو چکی تھیں۔ اس قدیم قبرستان سے مجھ جیسے لڑکوں کو صرف یہ دلچسپی تھی کہ بہت سی قبروں کے ہموار ہو جانے سے وہاں گولیاں یا بنٹے وغیرہ کھیلنے کے لئے خاصی جگہ

نکل آئی تھی۔ ہم وہاں کبھی بنٹے‘ کھیلنے کے لیے کھدی کھود لیتے‘ کبھی والی بال کے پول گاڑنے کے لیے زمین میں سوراخ کر لیتے اور کبھی پرانے کپڑوں کا فٹ بال بنا کر مٹی ہوئی قبروں پر خوب اودھم مچاتے۔ زیر زمین مردوں نے اب ہمیں کیا کہنا تھا۔ انہوں نے تو اپنی زندگی میں بھی اپنے اوپر کودنے والوں کو کبھی کچھ نہ کہا تھا البتہ حویلی والوں کی قبریں بلکہ مقبرے ہماری دست برد سے محفوظ تھے کیونکہ ان کے مالک بھی مضبوط تھے اور ان کی چار دیواری بھی!

ملک جابر علی خان نے‘ جن کی ہوس زمین ہر شے پر غالب تھی‘ یہ طے کیا کہ اس اجاڑ قبرستان کو ہموار کرکے یہاں امرودوں کا باغ لگایا جائے تاکہ اس سے آمدنی میں اضافہ ہو سکے۔ انہیں پہلے کسی نے کب روکا تھا جو اب کوئی مزاحمت کرتا۔ چنانچہ انہوں نے اونچی اونچی اور پکی قبروں کو ایک طرف چھوڑ کر باقی سارے قبرستان پر ٹریکٹر چلوا دیا۔ کسی نے زیر زمین ہڈیوں کی طرف توجہ دلائی تو ملک صاحب نے اپنے روایتی فیصلہ کن لہجے میں فرمایا "ہاں‘ انسانی ہڈیاں سب سے قیمتی کھاد کا کام دیتی ہیں۔" اس کے بعد انہوں نے وہاں امرودوں کا باغ لگا دیا جو بہت پھلا پھولا‘ ہمیں صرف اس بات کا رنج تھا کہ ہمارے کھیلنے کی اکلوتی جگہ چھن گئی۔

اس حویلی کی چوتھی اور آخری یاد جو بچپن کے زمانے سے میرے ذہن میں محفوظ ہے‘ ایک معمولی واقعے سے منسوب ہے۔ جب ہم میلے کچیلے‘ شب باشی کے کپڑے پہنے اپنے بستے بغل سے لٹکائے سکول جایا کرتے تھے تو عموماً راستے میں چار گھوڑوں کی بگھی یا چمکتی ہوئی کار حویلی سے شہر کی طرف جاتی ہوئی نظر آتی تھی۔ عموماً بگھی کے چاروں طرف اور کار کے دروازوں اور پچھلے شیشے پر سفید ریشمی پردے لٹکے ہوتے تھے تاکہ بیگم جابر علی خان گرد و غبار اور ایرے غیرے کی نظروں سے محفوظ رہ سکیں۔ ہمیں بیگم صاحب یا ان کے ریشمی پردوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی‘ ہمیں صرف یہ گلہ تھا کہ جب راستہ چلتے چلتے بگھی ہمارے پاس گذرنے لگتی تو کوچوان جو چار گھوڑوں کو چابک دکھانے

سے ہچکچاتا تھا' بلا جھجک ایک آدھ چابک شوقیہ طور پر ہمارے سروں پر برسا دیتا تھا جس سے احمد خان کے ڈنڈے کی طرح گومڑ تو نہ پڑتا البتہ چابک کی ایک لڑی ٹھنڈے یخ کانوں پر یوں پڑتی کہ کان سے کم از کم چوبیس گھنٹوں تک ٹیسیں نکلتی رہتیں۔ ہم یہ سب کچھ اسی طرح پی جاتے جس طرح ہمارے بڑھے بوڑھے ایک عرصے سے ملک صاحب کے جبر و استبداد کی دوسری وار داتیں پیتے اور سہتے آرہے تھے' لہٰذا جونہی بگھی چار منہ زور گھوڑوں سمیت آتی دکھائی دیتی ہم جھپاک سے سڑک چھوڑ کر شیشم کے تنے کے پیچھے چھپ جاتے۔ احتیاطاً ہم نے چمکتی کار کے متعلق بھی یہی رویہ اپنا رکھا تھا۔ راہ گیر سمجھتے کہ شائد ہم بگھی اور کار دھول سے دور بھاگ رہے ہیں دراصل ہم ملک جابر علی خان کے ملازموں سے پناہ مانگتے تھے۔

جس حویلی کے جاہ و جبروت کی شعاعیں یوں کس و ناکس کو متاثر کر رہی تھیں' اس کا ذرا تفصیلی تعارف بے محل نہ ہو گا۔

حویلی کے مغربی جانب گاؤں آباد تھا اور مشرقی جانب دریا بہتا تھا۔ اس دریا کا پاٹ بہت وسیع اور کنارے بہت نیچے تھے۔ عام حالات میں تو یہ دریا اپنی مستانہ روش پر بہتا رہتا تھا لیکن طغیانی کے دنوں میں یہ "چھل" مار کر اپنے کناروں سے باہر نکل آتا تھا اور ملک صاحب کی بہت سی زمین پر مٹیالے پانی کا لیپ کر کے واپس اپنے "کچھار" میں چلا جاتا تھا۔ ملک صاحب اس مٹی کو جسے مقامی زبان میں "ملہ" کہتے تھے' اللہ کی طرف سے نعمت سمجھتے تھے کیونکہ یہ "ملہ" بہترین کھاد کا کام دیتی تھی۔ جس سال دریا ایک پھیرا لگا جاتا اس سال مصنوعی کھاد ڈالے بغیر بھی فصل پہلے سے کہیں بہتر ہوتی۔

دریا کے اس پار اونچی اونچی گھاس' سر کنڈے' ڈب' جھاڑیاں اور خود رو درختوں کا گھنا جنگل تھا جو ایک قدرتی شکار گاہ کا کام دیتا تھا۔ ملک صاحب اکثر دریا پار کر کے وہاں شکار کھیلنے جاتے اور اپنے چیدہ چیدہ مہمانوں کو بھی شکار کھلانے لے جاتے۔ دریا خشک

ہوتا تو وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر اسے پار کر لیتے اور طاقتور گھوڑوں کے سم کہیں رکے ہوئے پانی کی چھوٹی چھوٹی جھیلوں میں سے شپ شپ کرتے گزر جاتے اور کہیں بکھری ہوئی خشک ریت میں دھنس جاتے لیکن وہ پانی میں رکتے نہ ریت میں بلکہ ہر صورت میں ملک صاحب اور ان کے مہمانوں کو شکار گاہ میں پہنچا دیتے۔ موسم برسات میں دریا پار کرنے کے لیے ملک صاحب نے دو کشتیاں بنوا رکھی تھی۔ ایک اپنے اور اپنے مہمانوں کے استعمال کے لیے اور دوسری شکار کے معاونین کے لیے۔ اگرچہ یہ کشتیاں دریا کے مغربی کنارے پر کھجور کے درختوں سے بندھی رہتی تھیں لیکن موسم برسات میں ان کا استعمال شاذ و نادر ہی ہوتا تھا کیونکہ ان دنوں جب دریا کا پاٹ کناروں تک لبالب بھرا ہوا ہوتا تھا' اس کے تیز بہاؤ کی وجہ سے کوئی بھی اس میں نہیں اترتا تھا۔ کئی مرتبہ تو کوئی تند و تیز لہر درخت سے جکڑی ہوئی کشتیوں کو بھی ہچکولے کھانے پر مجبور کر دیتی لیکن وہ مضبوط درخت سے بندھی ہونے کی وجہ سے دریا برد ہونے سے بچ جاتیں۔

دریا اور حویلی کے درمیان ملک صاحب کی زمینیں آباد تھیں جن میں ٹیوب ویل بھی لگے ہوئے تھے۔ جانوروں کا چارا یا بھوسہ وغیرہ رکھنے کے لیے دو تین کچی کوٹھڑیاں بھی بنی ہوئی تھیں۔ اور ایک مچان تھی جس پر چڑھ کر گرد و پیش کا بہتر نظارہ کیا جا سکتا تھا اور بعض اوقات ملازم غلیل یا ٹین کا خالی ڈبہ لے کر وہاں سے فصل تباہ کرنے والے جانوروں اور پرندوں کو اڑاتے رہتے تھے۔

ملک صاحب کی زیادہ تر زمینیں حویلی کے شمال اور جنوب میں واقع تھیں۔ شمالی زمینوں میں بہت سے باغات تھے...... کینو' مالٹے' سنگتروں' امرودوں اور سیبوں کے باغ جن میں انہوں نے حال ہی میں تجرباتی طور پر لیچی کے باغوں کا اضافہ کیا تھا۔ یہ باغ بڑھتے بڑھتے گاؤں کی طرف پھیل گئے تھے اور اس قرب کی وجہ ہی سے ایک دفعہ چند دیہاتی لڑکے مالٹوں کے باغ میں چلے گئے تھے اور ملک صاحب نے آئندہ ایسی حرکت پر ان کی ٹانگیں توڑ دینے کی دھمکی دی تھی۔ انہی باغوں کے ساتھ وہ پرانا قبرستان لگتا تھا جس پر ملک

صاحب نے ٹریکٹر چلوا کر اسے باغ میں ملا لیا تھا۔
حویلی کے جنوب میں ملک صاحب کے سولہ مربعے آباد تھے جن میں وافر مقدار میں گندم' کپاس' گنا اور دوسری فصلیں پیدا ہوتی تھیں۔ ملک صاحب نے ان زمینوں سے ملحقہ دوسروں کی زمین خرید کر ٹیکسٹائل ملز اور شوگر ملز لگوادی تھیں تاکہ سستے داموں خام مال بیچنے کی بجائے اس سے تیار کردہ مصنوعات مہنگے داموں فروخت کی جاسکیں۔ زراعت کے کاموں میں ان کا بڑا بیٹا پرویز علی خان ہاتھ بٹاتا تھا اور صنعت کاری میں ان کا نائب منجھلا بیٹا قدیر علی خان تھا۔ دوسرے دو لڑکے ابھی کالج اور یونیورسٹی کے آخری مراحل میں تھے۔
ملک صاحب اپنے پورے خاندان کے ساتھ ایک ہی حویلی میں رہتے تھے جس کی چار دیواری تو ایک تھی لیکن اندر اس کے پانچ حصے تھے جو شروع ہی سے بڑی سوچ بچار کے ساتھ تیار کیئے گئے تھے۔ چار حصوں میں انہوں نے چاروں لڑکوں کے لیے چار بنگلے بنوا رکھے تھے اور پانچویں اور مرکزی حصے میں ان کی اپنی رہائش تھی۔ اس وسیع و عریض حویلی کے صرف دو بڑے دروازے تھے۔ ایک شمال کی طرف کھلتا تھا اور دوسرا جنوب کی جانب۔ شمالی طرف کھلنے والا دروازہ در حقیقت ایک جدید وضع کا خوبصورت گیٹ تھا جس پر ہر وقت دو ملازم بھورے رنگ کی وردی پہنے موجود رہتے تھے۔ یہ وی آئی پی راستہ شمار ہوتا تھا۔ جس پر سے ملک صاحب' ان کی بیگم صاحب' ان کے بچوں اور اعلیٰ قسم کے مہمانوں کی سواریاں گذرتی تھیں' اور یہ دو ملازم (جو رات کو دو اور ملازموں سے اپنی ڈیوٹی بدل لیتے تھے) چوکیداری کا کام کرنے کے علاوہ آنے جانے والوں کو سلام بھی کرتے تھے۔ دراصل وہ چوکیداری کم کرتے تھے اور سلام زیادہ' کیونکہ ملک صاحب اور ان کے اعلیٰ تعلقات کا دبدبہ اتنا زیادہ تھا کہ وہاں ان کی اجازت کے بغیر کوئی چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھیں یعنی ملک صاحب کی اپنی ضرورت چوکیداری نہیں' سلام گذاری تھی۔
حویلی کی پشت پر جو دروازہ کھلتا تھا وہ دقیانوسی قسم کا پھاٹک تھا جو ٹین کی پرانی چادروں

کو لکڑی کے کھردرے فریموں میں فٹ کرکے تیار کرایا گیا تھا۔ وہ کھلتے اور بند ہوتے ہوئے چرر چرر کی بڑی ناگوار آواز نکالتا تھا لیکن ملک صاحب کی رہائش گاہ سے دور ہونے کی وجہ سے یہ آواز ان تک نہیں پہنچتی تھی' اور جو خرابی مالک تک نہ پہنچے ملازم اسے دور کرنے پر کم ہی توجہ دیتے تھے' لہٰذا یہ پھاٹک اسی حالت میں سالہا سال سے اناج اور نوکروں کی آمدورفت کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ پھاٹک کے ساتھ ہی ایک گھٹیا سی کوٹھڑی تھی جہاں ایک گھٹیا سا ملازم میلا سا رجسٹر لئے بیٹھا رہتا تھا۔ اس کا کام یہ تھا کہ گیراج سے نکلنے والے ٹرکوں' کاروں' جیپوں اور تانگوں کا حساب رکھے اور یہ نوٹ کرتا جائے کہ کونسی گاڑی کس وقت نکلی' کون لیکر گیا اور کب واپس آیا۔ یا کونسا ٹرک کیا لے کر اندر آیا اور کیا لے کر باہر گیا۔ اس کے علاوہ یہ ملازم آنے جانے والوں پر بھی نظر رکھتا تھا تاکہ کوئی ناپسندیدہ شخص حویلی میں داخل نہ ہونے پائے۔

حویلی کے اندر' خصوصاً ملک صاحب کی رہائش گاہ میں کچھ اور ہی سماں تھا' سامنے والے خوبصورت گیٹ سے داخل ہوتے ہی مرکزی حصے کی طرف بڑھتے ہوئے دائیں اور بائیں جانب پرویز اور قدیر کے خوبصورت بنگلے نما مکان پڑتے تھے جن کے آگے لمبی چوڑی بارہ سیڑھیوں پر سنگ مرمر کے گملے سجے ہوئے تھے جن میں چوڑے پتوں والے سدا بہار پودے بہار دکھا رہے تھے۔ خاص خاص موقعوں پر ان گملوں کے درمیان ننگی سیڑھیوں پر سرخ رنگ کا دبیز قالین بچھا دیا جاتا جو مہمانوں کے قدموں کو سہلاتا ہوا انہیں لاؤنج میں پہنچا دیتا تھا۔ لاؤنج سے آگے ڈرائنگ روم پڑتا تھا جہاں بیک وقت پچاس لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ یہ ڈرائنگ روم وال ٹووال کارپٹ' اعلیٰ فرنیچر اور دیدہ زیب تصویروں سے مزین تھا۔ تصویروں میں بین الاقوامی شہرت کے غیر ملکی مصوروں کے شاہکار بھی شامل تھے اور ان جگہوں کے لینڈ اسکیپ بھی جہاں بیرونی دوروں کے دوران ملک صاحب نے اچھا وقت گذارا تھا۔ ایک دیوار پر صرف پورٹریٹ ہی پورٹریٹ تھے جن میں ملک جابر علی خان سے لے کر ملک ہیبت علی (ابدالی) تک سب کی بڑے سائز کی تصویریں بنی ہوئی

تھیں۔ ان تصویروں کو نیچے شیشے کے فریم والی کیبنٹ رکھی تھی جس میں وہ کپ' میڈل اور خطوط وغیرہ سجے ہوئے تھے جن سے اس خاندان کی تاریخی عظمت کا پتہ چلتا تھا۔
ان میں سے ایک میڈل ملک جابر علی کے والد ملک وجاہت علی کے نام کا تھا جو دوسری جنگ عظیم کے دوران ان کی اعلیٰ خدمات کے اعتراف میں دیا گیا تھا۔ دوسرا میڈل ملک ہیبت علی کو ۱۸۵۷ء کے "غدر" کے بعد ان کی اعلیٰ کارکردگی کے لیے دیا گیا تھا۔ اسی طرح چند اسناد تھیں جو اعلیٰ انگریز افسروں نے مختلف موقعوں پر اس خاندان کی اعلیٰ خدمات کے لیے جاری کی تھیں۔ ایک خط ایک انگریز لیفٹیننٹ گورنر کا اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا تھا جو انہوں نے ملک صاحب کی پر تکلف دعوت میں شرکت کے بعد شکریہ ادا کرنے کے لیے لکھا تھا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ عجائبات خاصی حد تک اپنی آب و تاب کھو چکے تھے لیکن محض اس وجہ ڈرائنگ روم کی زینت بنے ہوئے تھے کہ ان سے حویلی والوں کی خاندانی آب و تاب میں اضافہ ہوتا تھا۔ اس ڈرائنگ روم کی بغل میں دونجی قسم کی نشست گاہیں تھی' ایک مردانہ اور زنانہ آگے پانچ بیڈ روم تھے جن میں سے دو ملک صاحب کے زیر استعمال تھے۔ ایک ملک صاحب کی اپنی خواب گاہ کے طور پر اور دوسرا ذکیہ بیگم کی استراحت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ چند برس بعد جب ملک صاحب نے دوسری شادی کر لی تو انہوں نے نئی دلہن کو اپنی ہی خواب گاہ میں جگہ دیدی۔ لیکن یہ ذرا بعد کی بات ہے فی الحال تو حویلی کی مکانیت اور وہاں پر میسر آسائشوں کی بات ہو رہی ہے۔
اگرچہ حویلی کے اس مرکزی حصے کا ہر پہلو دیدہ زیب تھا اور کوئی دیوار' فرش یا کوئی اور حصہ قیمتی ٹیپسٹری (TAPESTRY) یا پردوں سے عاری نظر نہ آتا تھا لیکن خوبصورت ترین حصہ ملک صاحب اور ان کی بیگم کا بیڈ روم تھا۔ مسہری اتنی وسیع اور آرام دہ تھی کہ اگر ایران کے سابق شہنشاہ بھی دیکھ لیتے تو حسد سے جل جاتے۔ مسہری کے دونوں جانب خوبصورت بیڈسائیڈ ٹیبل تھے جن پر سونے کے سٹینڈ والے ٹیبل لیمپ رکھے تھے۔

ان کے نئے سے نئے شیڈ ہر سال پیرس سے منگوائے جاتے تھے۔ تکیے اٹلی سے بھروائے گئے تھے اور غلاف جاپان سے در آمد شدہ تھے۔ ان تکیوں اور گداز بستر کے ریشمی کور اتنے نرم اور حساس تھے کہ خادمائیں جب صفائی کرکے فریشنر (FRESHNER) چھڑکتیں تو تکیوں کے غلافوں اور ریشمی چادروں میں ایک ملائم سی جھر جھری آجاتی۔ یہی حال پردوں کا تھا۔ درحقیقت دروازے اور کھڑکیوں پر ایک نہیں' تین تین قسم کے پردے آویزاں تھے جنہیں کنٹرول کرنے کے لیے مسہری کے سرہانے ایک بٹن لگا ہوا تھا جسے دبا کر آپ اپنی مرضی کے رنگ کا ہلکا یا دبیز پردہ پھیلا' یا سمیٹ سکتے تھے۔ یعنی اگر صبح دم آپ کو بھاری پردے گراں گذریں تو بٹن دبایئے یہ پردہ خودبخود ایک خفیہ خانے میں سمٹ جائے گا اور دوسرا بٹن دبانے سے نرم پیازی رنگ کا پردہ سامنے آ جائے گا۔ اگر دوپہر تک آپ اس رنگ سے اکتا چکے ہیں تو ایک اور بٹن دبایئے' تیسری قسم کا ہلکا آسمانی پردہ اس کی جگہ لے لے گا اور کھڑکی کے باہر نظر آنے والے آسمان سے ہم آہنگ ہو جائے گا۔

ہر بیڈ روم کے ساتھ دو باتھ روم تھے ایک زنانہ اور ایک مردانہ' اور دونوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر دونوں میں باتھ ٹب سے لے کر ٹائیلٹ پیپر تک ہر شے امپورٹیڈ تھے۔ دیوار کی ٹائلوں' فرش کی اینٹوں' ڈبلیوسی اور ٹب کا رنگ وہی تھا جو شمپو کی بوتل' شاور کیپ' صابن یا تولیوں کا رنگ تھا۔ پچھلی مرتبہ ملک صاحب سالانہ تعطیلات گذارنے جب سوئٹزرلینڈ گئے تو وہاں انہیں ایک نیا شاور پسند آیا جو واپسی پر خرید لائے۔ اس شاور میں خوبی یہ تھی کہ یہ آٹومیٹک واٹر پریشر کے ذریعے جسم کا مساج کر دیتا تھا یعنی آپ گرم اور ٹھنڈے پانی کا درجہ حرات میٹر کے مطابق سیٹ کر لیجیے اور پھر شاور کو باریک' درمیانہ یا موٹی دھار پر رکھ کر بٹن آن کر دیجیے تو وہ حسب خواہش باریک پھوار سے آپ کے جسم میں گد گدی کرتا رہے گا یا تیز اور موٹی دھار سے باقاعدہ مساج کر دے گا۔ ٹیلی ویژن' ٹیلی فون اور مغربی رسائل اس کے علاوہ تھے جن سے آپ ٹب میں لیٹ کر لطف اندوز ہو سکتے تھے۔

اسی حویلی کے زیر سایہ گاؤں کی پہلی گلی میں کلیم الدین عرف کلو رہتا تھا جس پر بیک وقت تین آفتیں آ پڑی تھیں۔ ایک یہ کہ حالیہ بارشوں میں اس کا کوٹھا گر گیا تھا' دوسرے یہ کہ اس میں رکھا ہوا ضرورت کا اناج بھیگ گیا تھا اور تیسرے یہ کہ اس کی جواں سال بیٹی کا جہیز بارش کا میلا پانی پڑنے کی وجہ ناقابل استعمال ہو گیا تھا۔
کلو کی بیوی پھلاں نے یہ دیکھنے کے لیے کہ جہیز کے کپڑے صرف اوپر اوپر سے خراب ہوئے ہیں یا نیچے تک پانی پھر گیا ہے' لکڑی کا پرانا صندوق کھلا تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گئی کہ نیچے پڑے ہوئے ریشمی سوٹوں' چھینٹ کی رضائیوں اور کھڈی کے بنے ہوئے کھیسوں کو چوہے کتر چکے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر پھلاں کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔
مالی نقصان جو ہوا سو ہوا' یہ سکینہ کی شادی کے لیے بہت بڑی بد شگونی تھی۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ پتہ نہیں اب میری بیٹی کا رشتہ ہو بھی سکے گا یا نہیں! یہ خیال آتے ہی وہ کانپ اٹھی اور کلمہ پڑھ کر پھونکیں مارنے لگی۔
بیٹی کی شادی کا مسئلہ تو اپنی جگہ بہت اہم تھا لیکن ان کی فوری ضرورت مکان کی تعمیر نو تھی جس کے لیے ان کے پاس وسائل نہ تھے۔ وہ اینٹوں کا آرڈر دے سکتے تھے نہ راج اور مزدور کام پر لگوا سکتے تھے' اور نہ سیمنٹ یا سریا خرید سکتے تھے۔ انہیں تو سب کچھ خود ہی کرنا تھا۔ بارش بھی عجب شے تھی' اس سے ملک جابر علی خان کے کھیت لہلہاتے تھے اور کلو جیسے لوگوں کے گھر تباہ ہو جاتے تھے۔
خدا خدا کرکے سورج نکلا تو کیچڑ بنی مٹی میں کچھ جان پیدا ہوئی۔ بابا کلو' اس کی بیوی پھلاں اور بیٹی سکینہ اس مٹی کو امید بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔ پھلاں اور سکینہ نے اپنے ہاتھوں سے مٹی کے دو دو' تین تین سیر وزنی گولے بنانے شروع کیے جنھیں کلو خشک مٹی میں رول کرکے گول اینٹوں کی شکل دیتا جاتا۔ یہ کچی اینٹیں صحن کے نسبتاً صاف حصے میں قطار در قطار سجادی گئیں تاکہ دھوپ پڑنے سے وہ ذرا سخت ہو جائیں تو ان سے دیوار چنی جاسکے۔ ایک دن خوب دھوپ پڑی تو گھر والے بہت خوش ہوئے۔

شام کو کلو نے مسجد میں جانے سے پہلے ان کچی لمبوتری اینٹوں کی نبض ٹٹولی تو پھلاں اور سکینہ کو تسلی دی کہ فکر نہ کرو' جان پکڑ گئی ہیں' بس ایک دھوپ اور لگ گئی تو پرسوں انشاء اللہ سامنے والی دیوار کھڑی کر لیں گے۔ کم از کم گلی میں سے گذرنے والوں سے تو کچھ پردہ ہو جائے گا۔ دونوں ماں بیٹی نے سکون کا سانس لیا اور اگلے روز کے سورج کا انتظار کرنے لگیں۔ کلو' پھلاں اور سکینہ رات کو "کھرے" آسمان کو دیکھ کر بڑی تسلی سے سوئے لیکن آدھی رات کو حویلی کے پار سے خلاف توقع کالے سیاہ بادل اٹھ آئے اور ملک جابر علی خان کے غصے کی طرح اچانک برسنے لگے۔ گھر میں کوئی ترپال' پرانی دری یا موٹا کپڑا بھی نہ تھا جسے وہ کچی اینٹوں پر بچھا سکتے۔ وہ تینوں ٹپکتے ہوئے برآمدے میں کھڑے ہو کر بے بسی سے اینٹوں کو تیز بارش کے ہاتھوں پٹتا دیکھتے رہے بالاخر پھلاں سے نہ رہا گیا تو وہ جھپٹ کر بارش میں آگے بڑھی اور اپنے سر سے دوپٹہ اتار کر اینٹوں پر پھیلا دیا...... لیکن اس سے کچی اینٹیں کہاں بچ سکتی تھیں' وہ پھر گارا ہو گئیں۔

کلو سے کہیں زیادہ پھلاں اور سکینہ کی خواہش تھی کہ دوبارہ مکان بناتے وقت کم از کم ڈیوڑھی کے سامنے والے حصے میں پکی اینٹیں لگائی جائیں جس سے نہ صرف ڈیوڑھی بلکہ اس میں رہنے والے بھی ذرا مضبوط لگیں گے اور دیکھنے والے ان کی مالی اور سماجی حیثیت کے متعلق ذرا بہتر تاثر قائم کریں گے لیکن پکی اینٹیں آئیں کہاں سے؟ سکینہ کلو کو بتایا کہ وہ جب گھر کا کوڑا کرکٹ پھینکنے کے لئے کھیتوں میں جاتی ہے تو راستے میں ایک اندھا کنواں پڑتا ہے جس کی منڈیروں پر ابھی تک پکی اینٹیں موجود ہیں۔ یہ کنواں ہندوؤں کی متروکہ زمین کے پاس واقع تھا جو ملک صاحب کی دستبرد سے صرف اس لئے بچ گئی تھی کہ ہندو اس جگہ اپنے مردے جلاتے تھے اور کسی نے ملک صاحب کو یہ کہہ کر ڈرا دیا تھا کہ جسم تو جل کر راکھ ہو جاتے ہیں لیکن روحیں خصوصاً بد

روحیں وہیں پھرتی رہتی ہیں۔ مسلمانوں کے قبرستان کے متعلق ملک صاحب کو کوئی ایسا حجاب نہ تھا' اپنے جو ٹھہرے!

سکینہ کا خیال تھا کہ اگر ابا جی اجازت دیں تو وہ واپسی پر اس اندھے کنوئیں کی پرانی انٹیں اکھاڑ کر اپنے خالی ٹوکرے میں لیتی آیا کرے' اور جب بہت سی اینٹیں جمع ہو جائیں تو وہ ڈیوڑھی کا ماتھا پکا کر لیں۔ کلو اور پھلاں نے اس تجویز پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ سکینہ کی قسط وار جمع کی ہوئی اینٹوں پر بھروسہ کیا گیا تو ڈیوڑھی والی دیوار تو عرصے تک نامکمل پڑی رہے گی' چنانچہ انہوں نے طے یہ کیا کہ وہ تینوں کنوئیں پر جائیں گے۔ کلو اینٹیں اکھاڑے گا' سکینہ اینٹیں چنے گی اور پھلاں ٹوکرے بھر بھر کر گھر پہنچاتی جائے گی۔

کلو دراصل بوڑھا ہو چکا تھا۔ اب کدال چلانا اس کے بس میں نہ تھا لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے کالے ٹخنوں اور کالی پنڈلیوں سے تہبند اوپر کر کمر کے ساتھ کس کر باندھا' ٹوٹی ہوئی جوتی اتار کر منڈیر سے پرے رکھی۔ دونوں ہاتھوں کو تھوک لگا کر کدال کے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کی اور زور زور سے پکی اینٹیں اکھاڑنے لگا۔ پہلی اینٹ پر کدال پڑی تو اینٹ اپنی جگہ پر ڈٹی رہی لیکن کدال اچٹ کر کلو کی پنڈلی پر آ لگی۔ چوٹ تو نہ آئی لیکن وہ وہیں جھک کر اسے سہلانے لگا۔ بیوی اور بیٹی کے سامنے ہار ماننا اس نے اپنی مردانگی کے منافی سمجھا تو پنڈلی کی سامنے والی ہڈی کو بار بار سہلانے کی بجائے وہ اسے کھجانے لگا جس سے اس کی سیاہ جلد پر ناخنوں کے سفید نشان پڑ گئے۔ اس نے تھوک سے انگلیاں گیلی کرکے نشان زدہ حصے میں مل دیں اور بے فکر ہو گیا۔

وہ پھر کدال چلانے لگا۔ کچھ اینٹیں سالم اور کچھ ٹوٹ کر منڈیر سے الگ ہونے لگیں۔ پھلاں اپنے ڈھیلے جسم اور ڈھیلے کپڑوں سمیت روڑے اور اینٹیں اکٹھی کرتی گئی۔ سکینہ نے ٹوکرا بھر کر کہا کہ وہ خود گھر ڈال آتی ہے لیکن ماں نے یہ سوچ کر منع کر دیا کہ جوان بیٹی بار بار ایک ہی گلی میں سے گذرے گی تو کسی کی نظریں بار بار

پڑنے سے کسی کے دل میں فتور آسکتا ہے' لہٰذا پھلاں کھلے پائنچوں والی میلی سی شلوار لٹکاتی ہوئی خود ہی اینٹیں ڈھونے لگی اور کلو اور سکینہ اندھے کنوئیں پر کام کرتے رہے۔

جب پھلاں پانچویں پھیرے پر گئی ہوئی تھی تو کلو کی کدال ایک ایسی سخت چیز سے ٹکرائی کہ وہ ٹن سے واپس آگئی۔ دراصل منڈیر سے ذرا نیچے' کنواں بنوانے والی کی سنگ مرمر کی یادگار تختی نصب تھی جس پر لکھا تھا۔

"سن تعمیر ۱۸۹۲ء

تعمیر شدہ

بحکم گپنت داس

از

مستری نور حسین۔"

لیکن یہ تختی سکینہ کو نظر آئی نہ کلو کو سکینہ جھٹ سے بولی "ابا یہ ضرور دولت کی دیگ ہوگی جو ہندوؤں نے کنوئیں میں دفن کر رکھی ہو گی۔"

"پاگل نہ بنو بیٹی! دوسروں کی چھوڑی ہوئی اینٹوں کے ٹوٹے اکٹھے کرنے والوں کو یوں دولت کی دیگیں ہاتھ نہیں آیا کرتیں۔"

"نہیں بابا' میں نے پریوں کی کئی کہانیوں میں سنا ہے کہ کسی غریب آدمی کو اچانک اندھے کنوئیں یا غار سے دولت بھری دیگ ہاتھ آگئی اور پھر اس کے دن پھر گئے۔"

"وہ کہانیاں ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی ہیں۔"

"تو کیا ہمارے دن کبھی نہیں بدلیں گے۔"

"جب تک اللہ کو منظور نہ ہو' کبھی نہیں بدلیں گے۔"

"تو ہمارے لئے اللہ کو کیوں منظور نہیں ہوتا...... ادھر ملک صاحب کو دیکھیں......"

"یہ سوال تیرے سوچنے کے نہیں...... تو اٹھا یہ روڑے' ڈھیری لگا اچھی طرح تیری ماں پھیرا لگا کر آنے ہی والی ہو گی۔"

پھر پھلاں آگئی اور ٹوٹی ہوئی اینٹیں اٹھا کر چلی گئی جب وہ دس پھیرے لگا چکی تو انہوں نے یہ کام ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ آخری مرتبہ ٹوکرا بھر کر سکینہ نے اپنے سر پر رکھ لیا کلو نے کدال سنبھال لی اور پھلاں نے اپنی ڈھیلی شلوار۔ وہ گھر کی طرف روانہ ہوگئے اور مغرب کی اذان تک گھر پہنچ گئے۔

جب کلو' پھلاں اور سکینہ نے گارے کی کچی اینٹوں' کنویں کی ٹوٹی اینٹوں اور اپنی بہت سے محنت سے اپنا مکان دوبارہ کھڑا کر لیا تو سکینہ بہت خوش ہو گئی۔ اسے گھر بنانے اور گھر سجانے کا بہت شوق تھا۔ وہ بچپن میں بھی برساتی نالے سے ریت لینے جایا کرتی تو ٹھنڈی ریت میں اپنا پاؤں دبا کر گھروندہ بنایا کرتی تھی اور ریت کو تھپک تھپک کر اسے خوب پکا کیا کرتی تھی' لیکن جونہی پیر نکالتی گھروندہ گر پڑتا۔ وہ تو اس کے باپ کے گھر سے بھی زیادہ ناپائیدار تھا...... ریت کا جو ٹھہرا!

اب سکینہ نے اپنے نو تعمیر شدہ مکان کی دیواروں کو بھوسہ ملی مٹی کا لیپ دیا۔ نرم مٹی میں نیل ملا کر اس پر ایک کوٹ اور کر دیا اور کچے فرش کو ایسے ہموار اور سخت بنا دیا کہ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ یہ سب سکینہ کے ہاتھوں کا کمال ہے۔ پھر وہ کسی سہیلی سے تھوڑا سا سبز رنگ لے آئی اور دروازے کے اردگرد سجاوٹ کے لیے اس کی دوہری لکیریں کھینچ دیں۔

اب سکینہ بہت خوش تھی لیکن اس کے والدین سخت پریشان کیونکہ سکینہ کی عمر ڈھلتی جا رہی تھی۔ اس کا جہیز خراب ہو چکا تھا اور کوئی رشتہ ابھی تک نظر میں نہیں تھا۔

پھلاں تو رات کو چارپائی پر لیٹ کر ٹھنڈے سانس بھرتی رہتی لیکن کلو جو اندر سے خود فکر مند تھا مرد ہونے کی وجہ سے پھلاں کو تسلیاں دیتا رہتا "سوجا پھلو۔ سوجا' اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی سبب بنا دے گا...... وہ سب کو دیکھتا ہے' سب کچھ جانتا ہے۔" ان روز روز کی طفل تسلیوں سے پھلاں اب تنگ آچکی تھی۔ اس کو رونے اور ٹھنڈی آہیں بھرنے کے سوا کچھ نہیں سوجھتا تھا۔

ایک رات وہ یوں ہی سکینہ کے دکھ میں مبتلا چارپائی پر لیٹی تھی کہ اچانک اسے دانت کا درد شروع ہو گیا۔ شروع میں اس نے اس کی پروانہ کی اور چپ لیٹی رہی۔ جب تکلیف برداشت سے باہر ہونے لگی تو اس نے اٹھ کر مٹی کے ایک برتن سے نمک کی ایک ڈلی نکالی۔ اسے مسالا رگڑنے والی سل پر رگڑا اور پسے ہوئے نمک کو انگلی سے تکلیف دینے والے دانت پر ملنا سروع کیا۔ سل پر رگڑنے کے باوجود نمک پوری طرح پسا نہیں تھا اس لئے اس کے ذرے پھلاں کے مسوڑوں کو تکلیف دینے لگے لیکن وہ دانت کی تکلیف دینے والے دانت پر ملنا شروع کیا۔ سل پر رگڑنے کے باوجود نمک پوری طرح پسا نہیں تھا اس لئے اس کے ذرے پھلاں کے مسوڑوں کو تکلیف دینے لگے لیکن وہ دانت کی تکلیف دور کرنے کے لیے مسوڑوں کی تکلیف برداشت کرتی رہی اور نمک ملتی رہی۔ نمک ملنے سے اس کے منہ سے بہت سا پانی بہہ گیا لیکن درد پتہ نہیں کہا چھپا بیٹھا تھا کہ پانی بہنے کے باوجود رفع نہ ہوا پھلاں حیران تھی کہ پہلے تو نمک ملنے سے درد دب جاتا تھا لیکن آج اس آزمودہ نسخے کا کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ جا کر دوبارہ چارپائی پر لیٹ گئی لیکن درد نے اسے زیادہ دیر لیٹنے نہ دیا۔ اب وہ کیڑا لگے دانت کے "کھوڑ" میں لونگ کا دانہ رکھنا چاہتی تھی لیکن اسے یاد نہیں پڑ رہا تھا کہ گھر میں لونگ ہے بھی یا نہیں اس نے یونہی پرانی چٹوریوں' فالتو گھڑوں اور متروک ہانڈیوں کی تلاشی لینا شروع کی لیکن کسی سے بھی کوئی لونگ نہ نکلا۔ البتہ ایک میلی سی پوٹلی ہاتھ آ گئی جس میں متفرق چیزیں بندھی ہوئی تھیں' پیر صاحب کے دیئے ہوئے آفتیں دور رکھنے والے تعویذ' رہن رکھی ہوئی زمین کے کاغذ "ملتہ" کا ٹکڑا اور ادرک کی تین گٹھیاں لیکن لونگ کے جس دانے کی ضرورت تھی' وہ کہیں نہ ملا حتی کہ صبح ہو گئی۔

لیکن پھلاں کو دانت کے درد کی نسبت سکینہ کا درد زیادہ تھا' اس نے کلو سے چوری چوری سارے گاؤں میں رشتہ تلاش کرنا شروع کر دیا۔ کلو سے چوری چوری یہ کام کرنے کی وجہ یہ تھی کہ گاؤں کے رواج کے مطابق ہمیشہ لڑکے والے لڑکی والوں کے پاس

جاتے تھے نہ کہ لڑکی والے' اور کلو جو اپنی غربت کے باوجود اپنی عزت کا بہت خیال رکھتا' اس بات پر رضا مند نہیں ہوتا تھا کہ خود ان کی طرف سے رشتہ دینے کے لیے اشارہ ہو...... لیکن پھلاں چپکے چپکے اس کام پر لگی رہی اور مہینے ڈیڑھ مہینے کے بعد وہ ایک رشتہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ لڑکے کا نام بوٹا خان تھا جو پانچ جماعتیں پڑھا ہوا اور سات کنال زمین کا مالک تھا۔ پھلاں نے جب کلو کو یہ خوشخبری سنائی تو ساتھ اتنا سا جھوٹ بھی بول دیا کہ رشتے کی درخواست لڑکے والوں سے آئی ہے اور وہ اکیلا گھر دیکھ کر بوٹا خان کو کلو کا گھر داماد بنانے کو تیار ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر اور کچھ نہ ہو سکا تو بوٹا کلو کی چھ کنال اور اپنی سات کنال یعنی کل تیرہ کنال زمین کاشت کرنے لگا تو تین چار آدمیوں کے لیے تو رزق پیدا کر ہی لے گا۔ ویسے بھی جوان ہے' فارغ وقت میں محنت مزدوری بھی کر سکتا ہے۔ چنانچہ شادی ہو گئی اور بوٹا خان' کلیم الدین عرف کلو کا گھر داماد ہو کر سکینہ کے لیپے ہوئے نئے مکان میں آباد ہو گیا۔

جب بوٹا خان کو سال بھر مشقت کے باوجود تیرہ کنال سے تیرہ من غلہ بھی نصیب نہ ہوتا تو وہ اکثر کڑھتا اور کہتا کہ اگر قیام پاکستان کے بعد نئے ملک کی کل زمینیں ملک کی کل آبادی میں تقسیم کر دی جاتیں تو یہاں نہ کوئی ملک جابر علی ہوتا اور نہ بابا کلو...... لیکن نیم خواندہ ہونے کی وجہ سے اسے یہ معلوم نہ تھا کہ یہاں ملک تقسیم ہو سکتے ہیں لیکن زمینیں تقسیم نہیں ہوا کرتیں!

ملک صاحب کے بڑے بیٹے پرویز علی خان کی عمر تیس بتیس سال کے لگ بھگ تھی لیکن سامنے سے سر کے بال سرک کر خاصے پیچھے چلے گئے تھے۔ اس کا گورا سفید چہرہ خوبصورت پیشانی سے ہوتا ہوا سر کے سامنے والے حصے تک پھیل چکا تھا اس وسیع و عریض علاقے میں صرف دو فصلیں اگی ہوئی تھیں' ایک کمانی دار بھویں اور دوسری رعب دار کالی گھنی مونچھیں' مونچھیں بھی ذرا مختلف قسم کی تھیں یعنی پرویز کی طرح صحت مند اور زور دار

لیکن کناروں سے عمودی طور پر کٹی ہوئی جیسے انہیں ہونٹ کے اوپر والے دو انچ حصے کو پار کرنے کی اجازت نہ ہو۔ میرا نہیں خیال کہ یہ حدبندی ملک جابر خان کی عائد کردہ تھی۔ شاید ان کے زیرسایہ رہتے رہتے پرویز نے یہ حد خود مقرر کر رکھی تھی۔

یہ راز بہت بعد میں کھلا کہ ذکیہ سے شادی کے پانچ سال بعد تک ملک صاحب کے ہاں کوئی اولادنرینہ نہ ہوئی۔ شروع شروع میں ایک بچی پیدا ہوئی جو بزرگوں کی جہالت' اور ذکیہ کی ضد کی وجہ سے پیدا ہوتے ہی مر گئی کیونکہ ذکیہ نے پہلی زچگی کے لیے شہر جانے اور کسی ہسپتال کے کمرے میں قید ہونے سے انکار کردیا تھا اور بزرگوں نے ملک صاحب کے اصرار کے باوجود ذکیہ کو گھر ہی پر تجربہ کار مگر ان پڑھ دائیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ بچی تو پیدا ہوتے ہی مر گئی لیکن ذکیہ بچ گئی۔ پھر ملک صاحب پیلی اور نیم مردہ سی ذکیہ کو لے کر شہر شہر ڈاکٹروں کے پاس پھرتے رہے اور دائیوں کے دیئے ہوئے نقص کا علاج کراتے رہے لیکن اس کے ہاں کوئی اولاد نہ ہو سکی۔

اس تلخ تجربے کے بعد ملک صاحب نے نہ اپنے دقیانوسی بزرگوں کو کبھی معاف کیا اور نہ دیسی دائیوں کو! جب بزرگوں کے دل میں حویلی کے وارث کی خواہش شدید ہوئی تو انہوں نے ملک صاحب کو اجازت دے دی کہ وہ ذکیہ کو علاج کے لیے ولایت لے جائیں۔

ملک صاحب ولایت چلے گئے' اور ادھر کسی کو بتائے بغیر ان کی والدہ نے چپ شاہ کی خانقاہ پر سنہری تاروں والی چادر چڑھانے کی منت مان لی۔ کوئی ایک سال کی دواؤں اور دعاؤں کے بعد اللہ تعالیٰ نے لڑکا دیا تو ملک صاحب کی والدہ نے اسے اپنی دعاؤں کا نتیجہ سمجھ کر اس کا نام اللہ دتہ رکھ دیا جو ملک جابر علی خان کو قطعاً پسند نہ آیا۔ وہ تو اپنے ایک انگریز دوست کے نام پر اس نیلی آنکھوں والے گورے بچے کا نام جان بیل (JOHN BELL) رکھنا چاہتے تھے لیکن والدہ نے سمجھایا کہ اب انگریز چلے گئے ہیں اور اس لئے اب ان کے نام پر بچے کا نام رکھنا مناسب نہیں۔ یہ بات ملک صاحب

کی سمجھ میں بھی آگئی کہ اب یہ نام رکھنے سے نہ تو کوئی انگریز خوش ہو گا اور نہ ہی کوئی جاگیر یا انعام و اکرام دے سکے گا لہٰذا انہوں نے کالج کے زمانے کے ایک مسلمان دوست کے نام پر اس کا نام پرویز علی خان رکھ دیا۔ کئی برس تک ملک صاحب کی ماں اپنے پوتے کو اللہ دتہ اور خود ملک صاحب اسے پرویز کہتے رہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب ماں اس جہان سے کوچ کر گئی اور ملک جابر علی مختار کل بن گئے تو ماں کا دیا ہوا نام سکڑ کر پیچھے رہ گیا اور ملک صاحب کا رکھا ہوا پرویز' زیادہ معروف اور مستعمل ہو گیا۔ سکول اور کالج میں بھی وہ پرویز ہی کے نام سے پکارا جاتا رہا۔

پرویز نے گورنمنٹ کالج سے بی اے پاس کیا اور آگے پڑھنا چاہتا تھا لیکن والد صاحب نے منع کر دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ پرویز بیرون ملک جائے اور شعبہ ذراعت میں کوئی ڈپلومہ یا تربیت لے کر آئے اور ان کا ہاتھ بٹائے جب کہ پرویز انگریزی ادب میں دلچسپی کی وجہ سے لٹریچر میں آگے بڑھنا اور پھر پڑھنے لکھنے کو اپنا مشن بنانا چاہتا تھا۔ ملک صاحب ادیبوں' شاعروں اور دانشوروں کے سخت خلاف تھے وہ کہتے تھے کہ یہ بے کار لوگ ہوتے ہیں جو صرف باتیں بنانا جانتے ہیں۔ شعر سیدھا کرنے سے تو ہل سیدھا کرنا کہیں بہتر ہے کہ اس سے فصل تو پیدا کی جا سکتی ہے جس سے کسی کا پیٹ بھر سکتا ہے' شعر سے تو پیاس بھی نہیں بجھتی بلکہ تیز ہوتی ہے۔

پرویز نے ایم اے (انگریزی) کی کلاس میں داخلہ لینے کے لیے بہت زور مارا۔ والدہ صاحب کے ایک دوست سے' جو اسی علاقے میں کمشنر تھے' سفارش بھی کرائی اور اس بیورو کریٹ نے یہ مثال بھی دی کہ چرچل بہت بڑا رائٹر تھا لیکن ملک صاحب نے یہ کہہ کر فوراً یہ مثال رد کر دی کہ ممکن ہے چرچل پہلے بھی رائٹر وائٹر رہا ہو لیکن اول اول وہ فرسٹ لارڈ آف دی سی بنا' پھر وزیر اعظم بنا' ہٹلر کے خلاف لڑا' اسے شکست دی اور بعد میں دوسرے جنگ عظیم پر ۱۲ جلدوں والی کتاب لکھ کر شہرت پائی اور پیس پرائز حاصل کیا۔ پرویز اگر رائٹر بنا چاہتا ہے تو وہ پہلے اپنے مقامی حریفوں سے لڑنا اور

انہیں شکست دینا سیکھے‘ پہلے وزیر اعلیٰ یا وزیر اعظم بنے اور پھر کتابیں لکھنے کی بلا پالے۔
کمشنر صاحب نے اپنی سفارش پر ذرا زور دیا تو ملک صاحب اپنے موقف پر اور ڈٹ گئے۔

انہوں نے کہا۔ ”کمشنر صاحب! آپ نے مجھ سے زیادہ علم پایا ہے لیکن آپ مجھے کوئی ایسی مثال لا دیجئے کہ کوئی شخص اپنے قلم کے زور پر حکمران بن گیا ہو‘ حالانکہ لوگ حکمران بننے کے طفیل رائٹر ضرور بنے ہیں...... پرویز میرا سب سے بڑا بیٹا ہے‘ اسے میرے بعد اس جاگیر کا مالک بننا ہے اور میرے جیتے جی میرا یہ فرض ہے کہ میں اسے اس رول کے لیے تیار کر جاؤں ورنہ ہمارے آباء و اجداد کی بنائی ہوئی یہ جائیداد ایرے غیرے لوگوں کے ہاتھوں میں چلی جائے گی‘ کمشنر تو کیا ان کے در پر تحصیلدار بھی نہیں آئے گا۔“

کمشنر صاحب چپ ہو گئے اور پرویز کی مزید تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے رک گیا البتہ بی۔اے کرنے کے بعد ملک صاحب نے اسے چند مہینوں کے لیے بیرون ملک بھیج دیا تا کہ دنیا دیکھ لے‘ عیش و عشرت کر آئے‘ اس کی آنکھیں کھل جائیں اور یورپ کے بعض ترقی یافتہ ایگریکلچرل فارم بھی دیکھ آئے۔ یوں ملک جابر علی خان کے آہنی شکنجے میں آ کر کلچر کی طرف بڑھنے والا پرویز ہمیشہ کے لیے ایگریکلچر کا ہو کر رہ گیا۔

اب وہ خود ایک خوبصورت بیوی کا شوہر اور دو ننھے منے بچوں کا باپ تھا لیکن تا حال اپنے باپ کے شکنجے میں ایک بے بس بچے کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ساری زمینیں‘ ان کی آمدنی‘ حساب کتاب سب کچھ ملک جابر علی خان کے پاس تھا اور وہ پرویز کو اپنے ہاتھ کی چھڑی کے طور پر ساتھ ساتھ لئے پھرتے تھے اور اس کا کام نوکروں کی طرح ان کے احکامات وصول کرنا‘ انہیں بجا لانا اور ساتھ ساتھ ڈیڈی‘ یس ڈیڈی (YES DADDY) کہتے جانا تھا۔

ایک دن ملک صاحب حسب معمول پرویز کو ساتھ لے کر زمینوں کی طرف نکلے مزارے اور دوسرے ملازم اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ ملک صاحب نے ماتھے پر جھکی ہوئی

گاف کیپ پہن رکھی تھی اور ہاتھ میں پیتل کے دستے والا ڈنڈا تھا جوان کی حاکمیت کی بھی علامت تھا اور پیدل چلنے کا ساتھی بھی وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتے اور ہر قدم کے ساتھ ڈنڈے والا ہاتھ آگے لے جاتے۔ جونہی ڈنڈا واپس آنے لگتا تو یہ دوسرا قدم آگے پھینک دیتے اور قدم کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھ کر ڈنڈے والا ہاتھ خود بخود آگے لپک جاتا۔ یوں ان کی چال بھی ان کی شخصیت کی طرح ایک منفرد انداز اختیار کر لیتی وہ جس طرف جا رہے ہوتے' اس کے دائیں اور بائیں جانب نگاہ ڈالتے جاتے اور جہاں کوئی قابل اعتراض چیز نظر آتی یا کوئی کام یاد آجاتا تو ڈنڈے کا نکیلا سرا زمین میں گاڑ کر کھڑے ہو جاتے۔

اس روز بھی وہ چلتے چلتے اچانک رک گئے اور ان کے پیچھے ایک قدم پر آنے والا پرویز بھی فوراً ٹھہر گیا جیسے سڑک پر ٹرک رکتے ہی پیچھے آنے والی سوزوکیاں دم سادھ لیتی ہیں۔ انہوں نے پرویز کی طرف منہ کیا اور زمین میں گڑا ہوا ڈنڈا نکال کر ایک درخت کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔ "میں پچھلے چھ مہینے سے دیکھ رہا ہوں کہ یہ درخت روز بروز سوکھتا جا رہا ہے۔ میں نے نورے کو کہا تھا کہ جنگلات والوں کو یہ درخت دکھائے۔ وہ اسے دیکھ گئے ہیں اور کہتے ہیں یہ ہرا نہیں ہو سکتا لہٰذا یہ خواہ مخواہ زمین کا رس چوس رہا ہے اسے فوراً کٹوا دو۔" ادب کے پرانے قاری پرویز کا جی چاہا کہ ملک صاحب کی خدمت میں عرض کرے کہ جو درخت اتنے عرصے سے زمین کا رس چوس رہا ہے' اب مرنے تک اسے کھڑا رہنے دیجئے۔ یہ کہا کہ انصاف ہے کہ جب تک درخت بار آور یا سایہ دار رہے اسے زمین پر کھڑا رہنے کا حق دیا جائے اور جونہی وہ کار آمد نہ رہے' اسے جڑ سے اکھڑوا دیا جائے۔ لیکن پرویز کی ہمت نہ پڑی کہ وہ اپنے والد صاحب کو یہ ناخوشگوار مگر سچی بات کہہ سکتے۔ وہ "یس ڈیڈی" کہہ کر خاموش ہو گیا۔

جب وہ چلتے چلتے اس کچی سڑک پر پہنچے جہاں سے ملک صاحب کے ٹرک اور ریڑھے زرعی اجناس لے کر گذرتے تھے تو ملک صاحب کو ٹرک کے ٹائروں کے تازہ نشان ملے اور سڑک کے کنارے پر دو تین گنے گرے ہوئے نظر آئے۔ وہیں رک گئے۔ مڑ کر پرویز

کی طرف دیکھا لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنی اٹھی ہوئی مونچھوں کو مزید اٹھا کر اسے کچھ حکم دیتے' انہیں پھتو مزارع نظر آ گیا۔ اسے ڈنڈے کے گندے سرے سے اشارہ کرکے اپنے طرف بلایا۔ اس نے دو تین بار جھک کر سلام کیا اور حکم کا انتظار کرنے لگا ملک صاحب نے کہا۔ "تمہیں اپنے چہرے پر دو بٹن نظر آرہے ہیں؟" سوال سمجھے بغیر پھتے نے جواب دیا۔ "جی حضور' جی حضور!" اس پر ملک صاحب نے جھڑک کر کہا۔
"ان بٹنوں کو استعمال کرو' وہ تین گنے اٹھاؤ اور بھاگ کر اس ٹرک کے پیچھے جاؤ' یہ گنے شوگر مل جانے والے ٹرک پر پھینکو اور ڈرائیور کو روک کر میری طرف سے کہو کہ وہ یوں مال راستے میں نہ گراتا جائے۔"
پھتہ حکم پاتے ہی تعمیل کے لیے دوڑ پڑا۔ ملک صاحب نے تبصرے یا رائے کے لیے پرویز کی طرف دیکھا تو اس نے فوراً کہا۔ "ٹھیک ہے ڈیڈی' یس ڈیڈی!" اور وہ دونوں آگے بڑھنے لگے۔ پرویز دل ہی دل میں سوچنے لگا ملک صاحب کی شخصیت میں یہ عجب تضاد ہے کہ ایک طرف تو کمشنر اور ڈائریکٹر جنرل زراعت اور دوسرے چھوٹے موٹے افسروں کی خاطر مدارات پر ہزاروں روپے خرچ کر دیتے ہیں اور دوسرے طرف گنے کے دو ٹوٹے گرنے پر اتنی سختی کرتے ہیں۔ لیکن حسب سابق اسے سوال پوچھنے یا وضاحت چاہنے کی ہمت نہ ہوئی۔
چلتے چلتے وہ ایک کھیت کے درمیان بھوسے کے گنبد نما ڈھیر کے پاس رک گئے جس کے اوپر تنکے ڈال کر مٹی کا موٹا لیپ کر دیا گیا تھا تاکہ بارش سے بھوسہ خراب نہ ہو۔ ایک طرف سے بھوسے کے اس انبار میں شگاف ہو چکا تھا کیونکہ مزارے وہاں سے روزانہ بھوسہ نکال کر مویشوں کو چارا ڈالتے تھے۔ پرویز ساتھ چپ کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب ملک صاحب بھوسے کہ اس گنبد نما ڈھیر میں کیا نقص نکالتے ہیں۔ اتنے میں ملک صاحب نے گاف کیپ اتار کر ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کہا۔ "پرویز' کچھ سمجھ میں آیا؟" اس نے نفی میں سر ہلایا تو انہوں نے بھوسے کے شگاف زدہ حصے کے پاس ڈنڈے کی نوک سے ایک چھوٹے سے سوراخ کی نشاندہی کی اور کہا۔ "یہ چوہوں کا کمال ہے' اور

تمہیں پتہ ہے کہ اگر بھوسے میں چوہے گھس جائیں تو وہ بھوسے کو ناکارہ کر دیتے ہیں' اور مزارعے بھی چوہوں کی گندگی والا بھوسہ مویشیوں کو ڈال دیتے ہیں جس سے وہ بیمار ہو جاتے ہیں۔ یاد ہے تمہیں پچھلے سال کالی گائے جو بیمار ہو گئی تھی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس گائے کی خوراک حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق تیار نہیں کی گئی تھی۔ لہٰذا احتیاط ضروری ہے' ہر کام مزارعوں پر نہ چھوڑا کرو' یہ بڑے کام چور ہوتے ہیں۔ آج ہی اسے ٹھیک کراؤ!"

"یس ڈیڈی۔"

دورے کے آخری مرحلے میں وہ ٹیوب ویل پر جا پہنچے۔ ٹیوب ویل چل رہا تھا اور ملازم اپنے کام کاج میں مصروف تھے۔ انہیں آتا دیکھ کر ایک نوکر نے جلدی جلدی دو کرسیاں اور ایک چارپائی بچھا دی۔ ٹیوب ویل کے پانی کے حوض کے پاس ہی اک نوکر کدال لے کر پانی کی نالی درست کر رہا تھا۔ چارپائی بچھانے والے نوکر سے ملک صاحب نے پوچھا۔ "ادھر نالی کون بنا رہا ہے؟

کرمے نے کہا "وہ پھتے کا بھتیجا ہے جسے چند دن پہلے کام پر لگایا ہے۔ آپ نے خود یہیں ٹیوب ویل پر پھتے پر یہ مہربانی کی تھی۔"

"ہاں' ہاں مجھے یاد ہے...... کوئی کام وام بھی کرتا ہے یا مجھے آتا دیکھ کر کدال اٹھالی ہے؟"

"نہیں حضور' وہ کام چور نہیں ہے۔ پھتے کی طرح خوب کام کرتا ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے...... تم ذرا پانی پلاؤ! تم بھی پیو گے پرویز؟"

پرویز نے نفی میں سر ہلایا اور کرما ٹیوپ ویل کے ساتھ والی چھوٹی سی کوٹھڑی سے مٹی کا وہ پیالہ لینے چلا گیا جس میں ملک صاحب پانی پیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے یہ ہمارا کلچر ہے' اسے چھوڑنا نہیں چاہیے۔ جب تک کرما پانی لاتا ملک صاحب نے ٹوپی اور چپل اتار دیئے۔ ٹوپی اتار کر سر پر ہاتھ پھیرا اور ماتھے سے نامعلوم پسینہ پونچھا۔ کرمے نے دونوں ہاتھوں سے ملک صاحب کو تازہ پانی کا پیالہ تھمایا اور خود ان کے قدموں میں

بیٹھ کر اپنی چادر سے ملک صاحب کے پاؤں کی مٹی جھاڑنے لگا۔ جب ملک صاحب پانی پی چکے اور کرما ان کے پاؤں کی مٹی جھاڑ چکا تو وہ پیالہ لے کر واپس کوٹھڑی میں رکھنے چلا گیا۔

ملک صاحب پرویز کو کچھ ہدایات دینے لگے۔

اس اثنا میں کدال چلانے والے نئے نوکر قربان کو پیاس لگی۔ وہ ٹیوب ویل پر زندگی کے آداب سے واقف نہ تھا۔ اس نے کدال رکھ کر ٹیوب ویل کے پائپ کے سامنے دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنانے کی بجائے کوٹھری کا رخ کیا۔ ملک صاحب والا مٹی کا پیالہ نکال کر ٹیوب ویل کے تازہ پانی سے بھرا اور غٹ غٹ چڑھا گیا' پھر پیالہ بھرا اور پی گیا۔ جب تیسری بار پیالہ بھرنے لگا تو اس کے خالی پیٹ میں پانی پڑنے سے ڈکار سے ملتی جلتی آواز نکلی۔ ملک صاحب جواب تک حقہ پی کر تازہ دم ہو چکے تھے' اس نئے ملازم کی طرف دیکھنے لگے۔ اس نے ٹیوب ویل سے وہی تازہ پانی پی لیا تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے ملک صاحب نے نوش فرمایا تھا۔ ملک صاحب یہ گستاخی نظر انداز کر گئے لیکن جونہی ان کی نظر پیالے پر پڑی' ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ انہوں نے کرمے کو آواز دی "اوئے کرمے! اس جنگلی جانور کو کچھ آداب سکھاؤ!" کرما جو اندر بھینسوں کو چارا ڈال رہا تھا یہ سمجھا کہ شاید ملک صاحب کا اشارہ اس بندر کی طرف ہے جو مویشیوں کے ارد گرد زقندیں بھر رہا تھا۔ اس نے وہیں سے جواب دیا۔ "حضور' آپ حکم دیں تو اس بندر کے بچے کو دور پھینک آئیں؟"

ملک صاحب نے فوراً حامی بھر لی۔

کرما جلدی جلدی 'گناوے' والے ہاتھ صاف کرکے ملک صاحب کے حضور پیش ہوا اور پوچھا کہ کیا حکم ہے ملک صاحب نے' جن کا غصہ ابھی تک ٹھنڈا نہیں ہوا تھا' کوٹھڑی سے مٹی کا پیالہ منگوایا اور کرمے کو بتایا کہ پھتو پتہ نہیں کس جانور کو اپنا بھتیجا بنا کر یہاں لے آیا ہے۔ اس ذرا ابھی تمیز نہیں میرے اور پرویز کے سامنے اس نے اسی پیالے میں پانی پی لیا جس میں میں نے ابھی پیا تھا۔ گستاخ' نانہجار کہیں کا! پھتے کو

بتانا کہ اگر اس لنگور کو یہاں رکھنا ہے تو اسے تمیز بھی سکھائے۔" یہ کہہ کر ملک صاحب نے کرمے کے ہاتھ سے پیالہ لیا اور زمین پر پٹخ کر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

اس غصے میں ملک صاحب اٹھ کر حویلی کی طرف چل دیئے' پرویز پیچھے پیچھے ہو لیا۔ آدھا راستہ طے کرنے کے بعد ملک صاحب نے پرویز کی طرف دھیان دیا اور کہا "یوں چپ شاہ کی طرح ساتھ ساتھ پھرنے سے تم کچھ نہیں سیکھ سکو گے' ذرا بات وات کیا کرو' کچھ سوال پوچھا کرو' کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو بلا جھجک پوچھ لیا کرو۔"

بات چیت کی اجازت بلکہ حکم ملنے پر پرویز نے کہا "اگر گستاخی نہ ہو تو ایک بات پوچھوں؟"

"ایک نہیں' سو پوچھو۔ کہو' کیا بات ہے۔"

"آپ نے اچھا کیا کہ پھتو کے بھتیجے کو نوکری سے نہیں نکالا لیکن میرے خیال میں اتنی چھوٹی سی بات پر غصہ دکھانے اور پیالہ توڑنے کی ضرورت نہ تھی۔"

"اچھا ہوا تم نے پوچھ لیا۔ دیکھ' نقصان تو صرف مٹی کے ایک پیالے کا ہوا جو ویسے بھی پرانا ہو چکا تھا اور میں اسے رد کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے اس پیالے سے نجات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ نوکروں کو بھی سیدھا کر دیا۔ اب کم از کم ایک ہفتے تک وہ اس واقعے کا ذکر کرتے رہیں گے اور جوں جوں یہ بات پھیلے گی' تمام نوکروں پر رعب پڑے گا۔ کوئی سی تک نہ کر سکے گا۔ یہ ہفتہ وار ڈوز (DOSE) بہت ضروری ہوتی ہے...... جب تک ان کمینوں کو دبا کر نہ رکھا جائے یہ کام نہیں کرتے اور اگر ڈھیل دی جائے تو گلے کو آتے ہیں...... سمجھے؟"

"جی ڈیڈی' یس ڈیڈی!"

یس ڈیڈی' یس ڈیڈی کا رویہ اپنانے کی وجہ سے ملک صاحب نے وہ تمام مراعات پرویز کو دے رکھی تھیں جن کا وہ تصور کر سکتا تھا' اور ملک صاحب کی شخصیت کا کلیدی پہلو بھی یہی تھا کہ جو کوئی ان کی جاہ و حشمت کے سامنے جھک جاتا اور یس سر' یس سر کی پالیسی اپنا لیتا' اس پر مال و منال نچھاور کر دیتے اور جو کوئی ان کے حلقہ اطاعت سے

باہر رہ کر عزت نفس کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا اسے وہ اپنے مخالفین میں شمار کرتے اور اس کی عزت نفس کے آبگینوں کو چور چور کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ بیٹا ہو یا بہو' مالی ہو یا مزارع' بیگم ہو یا مقامی افسر' اگر اس نے ملک صاحب کی حاکمیت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تو اس کے وارے نیارے ہو گئے ورنہ اس کی زندگی اجیرن ہو جاتی۔

پرویز اپنی افتاد طبع اور ماڈرن تعلیم کی وجہ سے اس نظام حیات کے سراسر خلاف تھا جس سے ملک جابر علی اپنی زندگی وابستہ کئے ہوئے تھے لیکن وہ اس کا شائبہ تک نہ ہونے دیتا تھا کہ وہ اندر سے ان کے اور ان کے فلسفہ حیات کے خلاف ہے کیونکہ وہ حویلی کے دوسرے مکینوں کی طرح بے بس تھا۔ اسے پتہ تھا کہ اس کی بیوی بچے جس آرام و آسائش کی زندگی بسر کر رہے ہیں وہ اس کی اپنی غیر مشروط اطاعت گذاری کا عطیہ ہے اور اگر اس نے کبھی حرف احتجاج بلند کیا تو اسے نہ صرف حویلی اور اس کی مراعات سے محروم کر دیا جائے گا بلکہ اسے مخالفوں کی صف میں شامل کرکے اس کا جینا حرام کر دیا جائے گا۔

اس عظیم قربانی کے عوض اسے آرام و آسائش کی زندگی میسر تھی۔

اس کے پاس تین بیڈ روم کی ایک کوٹھی تھی جس میں ساری آسائشیں موجود تھیں۔

ملک صاحب کی نیابت کے بعد پرویز اپنے گھر میں داخل ہوا تو مسز پرویزوی سی آر پر رنگین فلم دیکھ رہی تھی۔ اس نے سونے کی زنجیر گلے میں پہن رکھی تھی جس کے ساتھ پانچ تولے وزنی "اللہ" لٹک رہا تھا۔ کانوں میں سنہرے رنگ کے ٹاپس سجے تھے اور اس کا سارا لباس یعنی شلوار' قمیض' دوپٹہ اور جوتے سنہری رنگ کے ساتھ میچ کر رہے تھے۔

پرویز نے گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے وہی کام کیا جو سب ماڈرن خاوند کرتے ہیں یعنی بیگم کی تعریف اگرچہ یہ روز کا معمول تھا لیکن مسز پرویز اس تبصرے یا تعریف کا انتظار کرتی تھی' اور اگر کسی دن پرویز ملک صاحب کی کسی سرزنش سے بہت ہی پیچ

و تاب کھا رہا ہوتا اور آتے ہی بیگم کے حسن و آرائش کی تعریف نہ کرتا تو نہ صرف بیگم کا موڈ آف ہو جاتا بلکہ سارے گھر کا ماحول ہی بگڑ جاتا۔ آج پرویز نے ذرا مختلف انداز میں بیگم پرستی کا مظاہرہ کیا اور آتے ہی کہا "آج تو ہر طرف سونا ہی سونا ہو رہا ہے۔ کپڑے تو خیر کپڑے ہیں' آپ کا چہرہ بھی سونے کی طرح تمتما رہا ہے۔ نظر بد دور!" مسز پرویز اس تعریفی جملے سے بہت خوش ہوئی اور اگر پہلے نہیں تو کم از کم اب یہ تعریف سن کر اس کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ پرویز صوفہ گھسیٹ کر بیگم کے پاس ٹی وی کے سامنے بیٹھ گیا تو مسز پرویز نے بڑے فخر سے پانچ تولے وزنی تعویذ نما "اللہ" دکھا کر کہا "یہ ہے تاوہ گفٹ جو ابا جی نے مجھے برتھ ڈے پر دیا تھا۔ آج پہلی دفعہ پہنا ہے کیسا لگ رہا ہے؟"

"بہت عمدہ...... بہت ہی عمدہ! آخر گفٹ پہننے والا کون ہے! کیسے نہیں جچے گا؟"

وہ یوں نیم رومانی اور خالص تعریفی گفتگو میں مصروف تھے کہ باہر نعمان اور سلمان کے جھگڑے کی آواز آئی۔ نعمان اپنی ٹرائی سائیکل سے اکتا کر اپنے چھوٹے بھائی سلمان کے وڈیو گیم میں دخل اندازی کر رہا تھا۔ پرویز نے نوکروں کو آواز دی' "یعقوب' یعقوب....... اوئے قوبے! کہاں مر گئے تم'؟ دیکھ بچے کیوں لڑ رہے ہے۔" پرویز کی آواز سن کر رمضانی سامنے آگیا کیونکہ یعقوب کسی دوسرے کام میں لگا ہوا تھا۔ پرویز نے رمضانی کو وہی حکم سنایا اور وہ فوراً بچوں کو سنبھالنے چلا گیا۔

مسز پرویز صوفے سے اتر کر قالین پر بیٹھ گئی اور ٹی وی سٹینڈ کے نیچے سے فلموں کے وڈیو کیسٹ نکال کر نئی فلم کا انتخاب کرنے لگی اتنے میں مائی جیناں نے آ کر اطلاع دی کہ کھانا چن دیا گیا ہے' ویٹر انتظار کر رہے ہیں۔ پرویز نے فیصلہ دیتے ہوئے کہا۔ "بیگم اٹھو' پہلے کھانا کھا لیں' فلم بعد میں دیکھیں گے۔" مسز پرویز نے فوراً اس تجویز سے اتفاق کیا اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اٹھتے وقت اس کا پانچ تولے وزنی "اللہ" اس کے سینے پر لٹک رہا تھا اور اس کی قمیض کا لو نیک (LOW NECK) اور لو (LOW)

ہو گیا تھا۔
پرویز اور مسز پرویز ہی خوش و خرم' زیست کے جھولے میں جھولتے رہے۔
گاؤں میں بابا کلو' پھلاں' سکینہ اور بوٹا خان کے علاوہ بھی ڈیڑھ دو ہزار افراد رہتے تھے ان میں سے ایک کا نام گلاب دین عرف گلابا تھا جو بھیڑ بکریاں چرا کر گزر اوقات کرتا تھا۔ اس کی ماں بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھی اور باپ دوسری جنگ عظیم میں مارا گیا تھا اور گلابا اس دنیا میں دھکے کھانے کے لئے اکیلا رہ گیا تھا۔ اگرچہ ماہ و سال کے لحاظ سے وہ پرویز کا ہم عصر تھا لیکن وہ ان لوگوں میں سے تھا جو ایک ایک سال میں ایک ایک صدی کا اور ایک ایک مہینے میں ایک ایک سال کا بوجھ اٹھاتے ہیں اور وقت سے پہلے ہی بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ پرویز کی طرح گلابا کے سر کے بال بھی سامنے سے جھڑ گئے تھے جس کی وجہ سے اس کے چہرے کی سیاہی سر تک پھیل گئی تھی۔ صرف سامنے کے بال ہی نہیں جھڑے تھے بلکہ سر کی ساری فصل ہی قبل از وقت اجڑ گئی تھی اور اب یوں پتلے پتلے اور اکے دکے بال باقی رہ گئے تھے جیسے بجلی گرنے کے بعد درختوں کے جھلسے ہوئے ٹنڈ رہ جاتے ہیں۔
گلابے کا گھر صرف ایک کمرے اور نسبتاً وسیع صحن پر مشتمل تھا' صحن کے زیادہ تر حصے میں بھیڑ بکریاں کا باڑہ تھا جس کے دروازے کی جگہ دو بھاری پتھروں کے درمیان لکڑی کا ایک لمبا سا تختہ پھنسا رہتا تھا۔ اور اس کے باہر رکھوالی کرنے والا دیسی کتا بندھا رہتا تھا' گرمیوں میں گلابا بھی باڑے کے پاس ہی چارپائی ڈال لیتا تھا لیکن سردیوں میں وہ برآمدے میں موٹا سا پرانا لحاف اور بہت لمبی لاٹھی لے کر سوتا تھا کیونکہ وہ ۲۶ بکریوں' ۱۲ بھیڑوں اور چالیس میمنوں کو ذرا بھی آنکھوں سے اوجھل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہی تو وہ جائیداد تھی جو اس نے زندگی بھر میں کمائی تھی۔
وہ اپنی روٹی خود پکاتا تھا اور اگر شام کو دیر ہو جائے تو ماچھی کے تنور سے پکی پکائی روٹی لے آتا تھا اور بکری کا دودھ دوہ کر اس کے ساتھ کھا لیتا تھا' چنبی بکری اسے خاص طور پر پسند تھی کیونکہ وہ سال میں دس مہینے دودھ دیتی تھی۔ ادھر بچے دیئے اور ادھر

چند ہفتوں کے اندر اندر پھر اگلے جنم کی تیاری شروع کر دی۔ اس طرح نہ صرف گلابے کے گلے میں اضافہ ہوتا جاتا بلکہ اسے سارا سال دودھ بھی پینے کو ملتا رہتا۔ وہ کسی اور بکری کا دودھ پسند نہیں کرتا تھا وہ سب بکریوں کا کچا دودھ بیچ دیتا تھا البتہ چنبی بکری کا دودھ خود استعمال کرتا تھا...... یہی اس کی زندگی کا رس تھا۔

بھیڑ بکریوں کے علاوہ اس کے دو ساتھی اور تھے ایک ڈبو کتا جو رات دن' گھر باہر' اس کے ساتھ رہتا اور دوسرا گنجا طوطا جو ہر وقت پنجرے میں بند برآمدے کی چھت سے لٹکا رہتا۔ گلابا عموماً چنبی بکری' ڈبو کتے یا گنجے طوطے سے جی بہلاتا لیکن ان تینوں میں سے گنجا طوطا واحد ساتھی تھا جو اس کی باتوں کو جواب دیتا تھا' بس اسے دوچار جملے ہی یاد تھے اور وہ بوقت ضرورت انہیں جملوں کو دہراتا رہتا تھا "میاں مٹھو' چوری کھائے گا" "میاں مٹھو...... اللہ مالک" "میاں مٹھو رب راکھا۔"

گلابا حسب معمول صبح سویرے اٹھا' حقہ تازہ کیا' چنبی بکری کا تھن پکڑ کر پے درپے دودھ کی دھاریں اپنے گلے میں پھینکیں' کتے کو کھولا' باڑے کا پھاٹا ہٹایا اور طوطے کو "رب راکھا" کہہ کر اپنے معمول کے مطابق بکریاں چرانے روانہ ہو گیا۔ وہ عموماً گاؤں کے مغربی جانب بکریاں چرانے جایا کرتا تھا لیکن آج وہ شمال کی طرف نکل گیا جہاں کھیتوں میں ہریالی نسبتاً زیادہ تھی' لیکن یہ علاقہ ملک صاحب کے باغوں کے بہت قریب پڑتا تھا اس لئے ڈر کے مارے اکثر چرواہے اس طرف رخ نہیں کرتے تھے۔ گلابا بھی ادھر جانے سے کتراتا تھا لیکن آج گلی سے نکلتے ہی بھیڑوں کے ہر اول دستے نے ادھر منہ کر لیا اور گلابا بھی اللہ مالک ہے' کہہ کر گلے کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ جب وہ ملک صاحب کے باغوں سے دو تین کھیت دور رہ گیا تو گلابے نے بڑھ کر بھیڑ بکریوں کا رخ شمال مغربی کی جانب موڑ دیا۔ ڈبو کتا بھی اس کی زبردست اعانت کر رہا تھا۔ وہ دونوں مل کر گلے کو ہانکتے ہانکتے ملک صاحب کے باغوں سے خاصے دور نکل گئے۔

پہلے تو گلابا بکریوں کے ساتھ ساتھ رہا لیکن دوپہر کے وقت جب وہ تھک گیا تو بکریوں ڈبو کے حوالے کر کے ایک سایہ دار شیشم کے نیچے لیٹ گیا۔ وہیں اس کی آنکھ لگ

گئی۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ بیمار پڑ گیا ہے اور گاؤں والے اسے اس کی چہیتی بکریوں سے جدا کرکے ڈاکٹر کے پاس لے گئے ہیں جو اسے ٹیکہ لگا رہا اور ٹیکے کی سوئی اسے چبھ رہی ہے۔ اتنے میں اس کے جسم میں واقعی چبھن محسوس ہوئی اس نے ہڑبڑا کر آنکھ کھولی تو ملک جابر علی کا خونخوار ملازم نورا نیزے کی نوک اس کے پیٹ پر رکھ کر دبا رہا تھا۔ کالا سیاہ گلابا یکدم پیلا پڑ گیا۔ نورے نے سرخ سرخ آنکھیں نکال کر پوچھا "بکریاں کہاں ہیں؟" گلابا نے ادھر ادھر گھبرا کر دیکھا اور کہا "ڈبو......" ابھی وہ جملہ پورا نہ کر پایا تھا کہ نورا نے زناٹے دار تھپڑ گلابے کے منہ پر مارا اور کہا "ڈبو کے پتر۔ ادھر چل' ملک صاحب باغ میں بیٹھے تیرا انتظار کر رہے ہیں...... چکھاتے ہیں مزہ تجھے بکریاں کھلی چھوڑنے کا۔" گلابے نے بہت معافیاں مانگیں لیکن نورے کو ذرا ترس نہ آیا وہ اسے ہانکتا' پیٹتا اور گالیاں دیتا ملک صاحب کے پاس لے گیا۔

گلابا جاتے ہی ملک صاحب کے پاؤں پڑ گیا' انہوں نے پاؤں کی ٹھوکر سے اسے پیچھے ہٹایا اور کہا "بتاؤ' تمہیں کیا سزا دی جائے...... تمہاری بکریاں ضبط کرلی جائیں یا تجھے غائب کر دیا جائے گلابے نے بکریوں کی ضبطی کی دھمکی سنی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی اور عرض کیا کہ اگر آئندہ اس کی بکریاں ان کے کھیتوں میں دیکھی جائیں تو جو چاہیں سزا دے لیں لیکن اس دفعہ اللہ اور اس کے رسول کے نام پر اسے معاف کر دیں۔

ملک صاحب نے دس بارہ نوکروں کے سامنے گلابے کا منہ کالا کروایا۔ ناک سے زمین پر سات لکیریں نکلوائیں' کئی دفعہ توبہ کروائی اور آخر کار بکریوں سمیت اسے بھی رہا کر دیا۔ ملک صاحب اتنے ظالم نہیں تھے کہ کسی غریب کی عزت نفس کے علاوہ اسے کوئی مالی یا جانی نقصان پہنچاتے۔

گلابے کی روانگی کے بعد نورا زمین پر بیٹھ کر ملک صاحب کے پاؤں دبانے لگا۔

جب ملک صاحب اپنی مسرت اور رعونت میں مست تھے' تو نورے نے کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہی۔

"کہو کہو کیا بات ہے" "حضور' آپ نے ہم غریبوں پر ہمیشہ کرم کیا ہے' اگر آج بھی......."

"ہاں' ہاں' کہو...... کیا بات ہے؟"

"جناب میں تو آپ کا ایک عرصے سے نمک خوار ہوں' اور آپ کا نمک کھاتے کھاتے ہی مر جاؤں گا' لیکن میرے پچھلے گاؤں میں میرا بھائی ہے جو بہت غریب ہے۔ بارشوں میں اسکا مکان گر گیا تھا......."

"پیسے چاہئیں؟"

"اگر کرم ہو جائے تو دعائیں دیں گے۔ ہم بھی' اور میرا بھائی اور اس کے بال بچے بھی۔"

"کتنی رقم چاہیے؟"

"بس جی یہی کوئی ساڑھے تین ہزار روپے"

"تم منشی کے پاس جاؤ' میری طرف سے اسے کہو کہ تمہیں پانچ ہزار روپے دے دے"

"جناب بہت کرم آپ کا"

اسی شام نورا رقم لے کر اپنے بھائی کے پاس چلا گیا۔

ملک صاحب کا دوسرا بیٹا قدیر علی خان پرویز سے دو سال چھوٹا تھا۔ وہ نسبتاً دبلا اور طویل قامت تھا۔ اس نے ڈاڑھی اور مونچھیں صاف کرا رکھی تھیں۔ اور عموماً پتلون بش شرٹ پہنتا تھا۔ سردیوں میں فرنگی جیکٹ یا کوٹ کا اضافہ کر لیتا تھا اور عموماً اسی لباس میں فیکٹریا جایا کرتا تھا۔ اس نے بھی ملک صاحب کے حکم پر انٹرمیڈیٹ کے بعد تعلیم چھوڑ دی تھی اور پھر پانچ سال انگلستان میں رہ کر انڈسٹریل ٹریننگ حاصل کی تھی۔ ملک صاحب کا شروع ہی سے یہ منصوبہ تھا کہ بڑے لڑکے کو زراعت میں لائیں گے اور چھوٹے کو انڈسٹری لگا کر دیں گے تا کہ زمینوں پر پیدا ہونے والا خام مال دوسروں کے ہاتھوں فروخت نہ کرنا پڑے۔

چنانچہ جب قدیر انگلستان سے واپس آیا تو ملک صاحب نے شانتی نگر سے جنوبی طرف گاؤں

والوں کی ایک ایک' دو دو ایکڑ زمین خرید کر کوئی چالیس ایکڑ کا رقبہ حاصل کر لیا۔
قدیر نے ہلکا سا اشارہ کیا کہ گاؤں والے اسے استحصال کا نام دیں گے اور واویلا کریں گے تو ملک صاحب نے فرمایا یہ تو ہم ان پر بہت بڑا احسان کر رہے ہیں' بارانی زمین سے کیا آتا ہو گا انہیں! اب یہاں فیکٹری لگے گی' ان کے لئے رزق حلال کمانے کے مواقع پیدا ہونگے۔ دن بھر فیکٹری میں کام کریں گے اور رات کو اپنے گھر میں سکون کی نیند سوئیں گے۔ اس میں کوئی زیادتی نہیں۔
یہ سن کر قدیر حسب عادت خاموش ہو گیا ور ملک صاحب نے وہاں ملک انڈسٹریل اسٹیٹ قائم کر دی۔
اس اسٹیٹ میں شروع شروع میں توتین یونٹ تھے۔ ایک ٹیکسٹائل مل' ایک شوگر مل اور ایک ہسکنگ فیکٹری۔ لیکن بعد میں وہ پھیل کر چودہ یونٹ بن گئے اور ملک صاحب اس ترقی اور توسیع کا سہرا قدیر کے سر باندھتے تھے لیکن روپے پیسے کا حساب کتاب اپنے پاس رکھتے تھے اور پرانی مشینری کی تبدیلی یا نئی مشینری کی در آمد سے لے کر مال کی خرید و فروخت تک ہر فیصلہ خود کرتے تھے۔
قدیر پر بھی ملک صاحب کی خاص عنایات تھیں۔ اسے بھی انہوں نے حویلی کے اندر ہی ایک کوٹھی بنوا کر دے رکھی تھی جہاں وہ اپنی دلہن سلمٰی اور اکلوتے بیٹے وقار (وکی) کے ساتھ رہتا تھا۔ پرویز کے گھر کی طرح یہاں بھی وی سی آر' رنگین ٹیلی ویژن' وڈیو گیمز اور دوسری آسائشوں کی بھر مار تھی کیونکہ قدیر بھی ملک صاحب کی حاکمیت کے سامنے دم نہیں مارتا تھا البتہ پرویز کی طرح ہر وقت یس ڈیڈی' یس ڈیڈی کی رٹ لگانے کی بجائے ان سے کھل کر بات کر لیتا تھا اور دلیل کے جواب میں دلیل بھی دیتا تھا' لیکن بالاخر ملک صاحب جو فیصلہ کر دیتے اسے بلاچوں و چراقبول کر لیتا تھا' اور پھر پوری دیانت داری سے اس پر عمل کرتا تھا۔
قدیر کا معمول یہ تھا کہ وہ سلمٰی کے ساتھ مل کر ناشتہ کرتا۔ ایک گاڑی سلمٰی اور بچوں

کے پاس چھوڑ کر دوسری گاڑی پر فیکٹری چلا جاتا....... وہ دوپہر کا کھانا گھر سے منگوا کر فیکٹری ہی میں کھاتا اور شام کو سورج ڈوبنے سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے گھر واپس آجاتا۔ فیکٹری میں ملک صاحب نے بڑی بڑی تنخواہوں پر مینیجر، ڈپٹی مینیجر، فورمین، سپروائزر اور کارکن بھرتی کر رکھے تھے اور اگر قدیر فیکٹری نہ بھی جاتا تو کام تسلی بخش طور پر چلتا رہتا لیکن ملک صاحب کا اصرار تھا کہ وہ ہر روز فیکٹری جایا کرے اور فیکٹری کے اوقات میں وہاں ٹھہرا کرے کیونکہ اس کے فلسفہ حیات کے مطابق کوئی بھی ملازم وہ خواہ کتنا ہی وفادار کیوں نہ ہو، مالک کی غیر حاضری میں ضرور ست پڑ جاتا ہے۔ مشین کا پرزہ ٹوٹ جائے تو اسی وقت آدمی کو شہر دوڑانے کی بجائے کام اگلے دن پر ڈال دیتا ہے۔ بجلی فیل ہو جائے تو COMPLAINT لکھانے پر اکتفا کر لیتا ہے، اور اگر کوئی کارکن شفٹ چھوڑ کر سگریٹ پینے نکل جائے تو درگزر کر دیتا ہے اور یہی وہ عناصر تھے جو ملک صاحب کے بقول کسی بھی کاروبار کا "بھٹہ" بٹھا دیتے ہیں۔ لہٰذا وہ قدیر کو وہاں زیادہ سے زیادہ وقت گذارنے کی تاکید کرتے تھے اور وقتاً فوقتاً بغیر اطلاع دیئے خود بھی فیکٹری کا چکر لگا لیتے تھے۔

ایک دن ملک صاحب اچانک انڈسٹریل اسٹیٹ جا پہنچے اور سیدھے قدیر کے دفتر میں جانے کی بجائے فیکٹری کے اندر چلے گئے وہاں GINNING SECTION میں دو ملازم سگریٹ پی رہے تھے انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے انہیں برخاست کر دیا اور کہا کہ جاؤ کیشیئر سے جا کر اپنا حساب کروا لو۔ ٹیکسٹائل کے شعبے میں گئے تو مشینیں دھڑا دھڑ چل رہی تھیں لیکن کوئی مشین مین یا سپروائزر موجود نہیں تھا۔ وہ بڑے جزبز ہوئے، فوراً فورمین کے دفتر میں گئے اور ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"فورمین صاحب! آپ کا کام دفتر میں بیٹھنا نہیں، مشینوں پر نظر رکھنا ہے۔"

"مشینیں تو ٹھیک ٹھاک چل رہی ہیں ملک صاحب!"

"وہ تو میں نے بھی دیکھ لی ہیں، مشینوں کا کام چلنا ہے وہ تو چلتی رہیں گی لیکن وہاں ان کے سر پر کوئی آدمی نہیں ہے۔"

"سب مشینیں آٹو میٹک ہیں ملک صاحب۔ ایک دفعہ چلا دی جائیں تو اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔ یہ انسانوں کی طرح کام چور نہیں ہیں۔"

"پھر بھی ان پر آدمی ہونا چاہیے۔"

"جی، ہر سیکشن میں ایک ایک مشین مین ہے۔ شاید آپ ہوزری ڈیپارٹمنٹ تشریف لے گئے تھے۔ وہاں سے فضل دین کو میں نے قدیر صاحب کے پاس بھیجا ہے، ان کے بلوانے پر، آنا ہی ہو گا۔ آپ تشریف رکھئے!"

ملک صاحب یہ دعوت ٹھکرا کر فورمین صاحب کو کرسی سے چمٹے رہنے کی بجائے مشینوں پر توجہ دینے کی تاکید کی اور فیکٹری کے دوسرے حصوں کا دورہ کرکے قدیر کے پاس جا پہنچے۔ قدیر اس وقت اپنے کسی مہمان کی تواضع کر رہا تھا۔ وہ ملک صاحب کو آتے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ان کا استقبال کیا، مہمان کا تعارف کرایا اور چپڑاسی کو ایک کپ اور لانے کو کہا۔ ملک صاحب بیٹھنے کو تو بیٹھ گئے۔ لیکن اندر ہی اندر کڑھ رہے تھے کہ فیکٹری کے اندر کام میں حرج ہو رہا ہے اور قدیر دفتر میں بیٹھا مہمان نوازی کر رہا ہے۔ وہ اس موقع کی تلاش میں تھے کہ کب یہ مہمان اٹھے اور قدیر کو تنبیہہ کریں۔ ایک دفعہ تو انہیں خیال آیا کہ وہ مہمان کو وہیں بیٹھا رہنے دیں اور قدیر کو باہر بلا کر جھاڑ پلا دیں، لیکن وہ ضبط کرکے بیٹھے رہے۔

ابتدائی تعارف میں قدیر نے اجنبی شخص کا صرف نام بتایا تھا،ایم اے رؤف۔ اب ملک صاحب نے مہمان سے براہ راست پوچھا لیا۔

"کیوں میاں! کیا شغل ہے آج کل؟"

قبل اس کے کہ رؤف صاحب کچھ کہتے، قدیر نے جواب دیا۔

"ڈیڈی! یہ ہمارے انڈسٹریل ایریا کے نئے ایکسائز انسپکٹر ہیں، جی ایم شاہ کی جگہ آئے ہیں۔ کل ہی چارج لیا ہے انہوں نے۔ میں نے کل ہی انہیں یہاں تشریف لانے کی دعوت دے دی تھی۔ جی ایم شاہ صاحب جانے سے پہلے ہمارا تعارف کرا گئے تھے۔"

ملک صاحب نے مصنوعی ناراضی سے کہا۔

"بڑے نالائق ہو قدیر' تم نے کچھ نہیں سیکھا پچھلے آٹھ دس برس میں۔ رؤف صاحب کو یہاں زحمت دینے کی بجائے گھر پر بلاتے' باقاعدہ انوائٹ (INVITE) کرتے۔۔۔۔ شہر سے دوسرے احباب کو بھی بلواتے...... تم نے ناک کٹوا دی ہماری...... نالائق کہیں کے!"

رؤف نے کہا

"نہیں ملک صاحب' ایسی کوئی بات نہیں' جب آپ کہیں گے گھر پر بھی حاضر ہو جاؤں گا لیکن میرا اصل کام تو یہاں ہے نا' فیکٹری میں! اس لئے پہلے فیکٹری میں چلا آیا۔"

"نہیں بیٹے' اصل کام گھر پر ہوتا ہے نا' فیکٹری میں! اس لئے پہلے فیکٹری میں چلا آیا۔"

"نہیں بیٹے' اصل کام گھر پر ہوتا ہے' فیکٹری میں نہیں...... خیر آپ نئے نئے آئے ہیں' ملاقات رہے گی تو ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیں گے۔"

یہ کہہ کر ملک صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور قدیر کو مہمان کا خاص خیال رکھنے کی تاکید کرکے زمینوں پر چلے گئے۔

شام کو گھر پر قدیر اور ملک صاحب کی آپس میں ملاقات ہوئی تو قدیر نے کہا۔ "ڈیڈی! آپ ہمیں کب تک بچہ سمجھتے رہیں گے؟"

"جب تک میں زندہ ہوں...... کیونکہ باپ کو اپنی اولاد ہمیشہ چھوٹی دکھائی دیتی ہے' خواہ وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو جائے۔"

"وہ تو اپنی جگہ درست ہے لیکن آپ اس بات کو کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں کہ لندن میں پانچ چھ سال ٹریننگ لینے اور یہاں پچھلے آٹھ سال سے عملی طور انڈسٹریل اسٹیٹ چلانے کے بعد میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ زندگی کے کچھ فیصلے خود بھی کر سکوں' کم از کم ایکسائز انسپکٹر کو ہینڈل کر سکوں۔ آپ تو آج یوں غصے میں میرے دفتر میں داخل ہوئے کہ شاید مجھے کچا ہی کھا جائیں گے...... اور بیٹھنے کے بعد پانچ دس منٹ تک آپ کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ آپ ابھی پھٹ پڑیں گے اور مہمان کے سامنے

میری بے عزتی کر دیں گے۔ سچ پوچھئے ڈیڈی تو اس سارے وقت میں ڈرتا رہا اور دعا کرتا رہا کہ سچوایشن (SITUATION) خراب نہ ہونے پائے۔ میں نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا جب رؤف صاحب کی طرف آپ کو متوجہ ہوتے دیکھا اور پہلے جملے ہی میں فضا صاف ہو گئی۔"

"قصور تمہارا ہے سراسر...... تم نے تعارف کراتے ہی کیوں نہ بتا دیا کہ وہ ایکسائز انسپکٹر ہے' "میٹ مائی فرینڈ مسٹر رؤف" کہنے سے تو بات نہیں بنتی...... خیر' وہ تو اچھا ہوا اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تم انسپکٹر پر خصوصی توجہ دے رہے تھے' لیکن اندر فیکٹری پر بھی توجہ دیا کرو۔ جننگ فیکٹری میں اتنا گند پڑا ہوا ہے کہ وہاں سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ ٹیکسٹائل کے شعبے میں جہاں پچھلے دسمبر میں نئی مشینری لگوائی تھی کوئی آدمی موجود نہ تھا' اگر دھاگا اڑ جائے' مشین رک جائے یا کوئی اور خرابی ہو جائے تو......"

"وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن میں آپ کی توجہ ان روٹین معاملات سے ہٹ کر چند اہم پہلوؤں کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔"

"بولو!"

"بات یہ ہے کہ انٹرنیشنل مارکیٹ میں کاٹن کارپٹ بہت ہائی جا رہا ہے۔ اگر آپ پسند فرمائیں تو ہم اپنی ضرورت کی بیلز (BALES) رکھ کر باقی ساری کاٹن ایکسپورٹ کر دیں۔ ایک تو گودام میں جگہ خالی ہو جائے گی اور دوسرے پیسے اچھے مل جائیں گے۔ ہماری مصنوعات سے بھی بڑھ کر......"

"اور دوسری بات کیا تھی؟"

"دوسری یہ کہ فیکٹری کی پک اپ (PICK-UP) بہت کھٹارا ہو گئی ہے۔ جنرل ڈیوٹی کے لئے ہم اس پک اپ کو استعمال کرتے ہیں۔ چھوٹے موٹے سرکاری اہلکاروں کو بھی پٹرول ڈلوا کر یہی گاڑی بھجواتے ہیں۔ ایک تو پٹرول بہت کھاتی ہے اور پھر یہ راستے میں رک جاتی ہے جس سے سرکاری عملہ ناراض ہوتا ہے اور انتقاماً کبھی بجلی بند کر

دیتا ہے' کبھی ٹیلیفون کا بل زیادہ بھیج دیتا ہے' کبھی ویسے ہی تنگ کرنے لگتا ہے۔"

"اور تیسری بات......." "تیسری بات یہ ہے کہ میں چاول چھڑنے والی مشین پر کام کرنے والے مزدور علیا (علی محمد) کو ڈسمس کرنا چاہتا ہوں۔ سارا دن ایک پیسے کا کام نہیں کرتا اور الٹا فیکٹری کی لیبر کو پٹیاں پڑھاتا رہتا ہے۔ پتہ نہیں آپ نے اسے ملازم کیسے رکھ لیا تھا......."

"اور چوتھی بات؟"

"چوتھی بات آپ کو پھر بتاؤں گا...... پہلے آپ ان تینوں باتوں کا فیصلہ کر دیں!"

"نہیں' تم چوتھی بات بھی کہہ ڈالو تا کہ تم ہلکے ہو جاؤ۔"

"بات یہ ہے ڈیڈی کہ آپ کے زمانے میں فوکس ویگن بڑی پاپولر کار ہوتی تھی۔ مجھے یاد ہے ہمارے بچپن میں جب گیراج میں صرف چار کاریں ہوا کرتی تھیں' ان میں سے دو فوکسی تھیں...... دونوں ویرنٹ (VARIANT) شاید وہ اس لئے آپ کو پسند تھیں کہ فوکس ویرنٹ کی پچھلی سیٹ کی پشت پر سپیس (SPACE) ہوتی تھی جس میں گنے' مالٹے' کینو' آم یا بچے لادے جا سکتے تھے لیکن اب گاڑیوں میں ایسی چیزیں کوئی نہیں لادتا۔ بچے تو بالکل ہی نہیں بیٹھتے' کہتے ہیں وہاں بیٹھنے سے انسان لنگور لگتا ہے' ڈیڈی آپ نے ہماری گھریلو کار بدلوانی ہی ہے تو ٹیوٹا کار سے بدلوایئے' فارگاڈسیک .... (FOR GODS SAKE) ہمارے گلے فوکسی نہ ڈالئے' ہم سب تنگ ہیں اس میک (MAKE) اور ماڈل سے!"

تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد ملک صاحب نے حسب ذیل فیصلے سنائے۔

۱۔ کاٹن تم نہیں بیچو گے' ہم خود ہی استعمال کریں گے۔ جب تمہاری طرح سب لوگ کاٹن ایکسپورٹ کریں گے تو انٹرنیشنل مارکیٹ میں ریٹ خود بخود گر جائیں گے۔ اتنے ہوشیار نہ بنو۔ کاٹن سنبھال کر رکھو۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ اس سے کس طرح زیادہ سے زیادہ پرافٹ (FROFIT) لینا ہے۔

۲۔ ہائی ایس پک اپ نہ بیچو' ایک دو دفعہ راستے میں رکے گی تو چھوٹے موٹے اہلکار

خود ہی مانگنا چھوڑ دیں گے' نئی گاڑی لے کر دی تو چھ مہینے کے اندر اندر کھٹارا بنا دیں گے اور ڈیمانڈ بھی بڑھ جائے گی۔ اعلیٰ افسروں کو ٹوٹا کار بھیج دیا کرو اور عام کارندوں

کے لیے یہی کھٹارا رہنے دو۔

۳۔ چاول چھڑنے والی مشین پر کام کرنے والے مزدور کو ڈسمس مت کرو' آج کل مزدور بہت مشکل سے ملتے ہیں۔ اسے فیکٹری کے کسی ایسے شعبے میں بھیج دو جہاں اسے آٹھ گھنٹے کام کرنے سے کسی شرارت کا ہوش ہی نہ رہے اگر پھر بھی قابو میں نہ آئے تو زمینوں پر بھیج دینا' میں اسے سیدھا کر لوں گا۔

۴۔ فوکس ویگن کا آرڈر میں دے چکا ہوں۔ تم نے شاید اس کا نیا ماڈل نہیں دیکھا' بہت خوبصورت ہے۔ تم دیکھو گے تو پسند کرو گے۔ بہت RELIABLE گاڑی ہے۔ تم نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے' میں نے ساری عمر یہی گاڑی استعمال کی ہے۔ اس نے کبھی مجھے لیٹ ڈاؤن (LET DOWN) نہیں کیا۔ شکل میں کیا پڑا ہے' گن دیکھنے چاہئیں' انسان ہو یا کار۔"

ان فیصلوں کے بعد قدیر اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔ اب اس میں مزید جرات نہ تھی کہ ملک صاحب سے بحث کرتا کیونکہ اسے پتہ تھا کہ ملک صاحب بحث کرنے والے کو پسند نہیں کرتے۔

گاؤں میں میراں بخش کا کنبہ دوسرے کنبوں کی طرح غربت و افلاس میں جکڑی ہوئی زندگی گذار رہا تھا۔ اس خاندان کے کل چھ افراد تھے۔ میراں بخش' اس کی بیوی شریفاں' دو بیٹے اسحاق اور فرمان اور ایک بیٹی شیداں جو دونوں بھائیوں سے چھوٹی تھی۔ خاندان کا چھٹا فرد مرجان تھی جو میراں بخش کی بہن تھی اور شادی کی سہاگ رات سسرال میں گذار کر ہمیشہ کے لیے میکے بیٹھ گئی تھی' دوسری شادی کا نام نہ لیتی تھی اور یہیں بیٹھے بیٹھے بڑھاپے کی دہلیز تک پہنچ گئی تھی لیکن بڑھاپا تو کیا ادھیڑ عمری کا بھی اعتراف نہ کرتی تھی۔ ہر وقت بنی ٹھنی رہتی یعنی کالی شلوار پر سفید قمیض پہنتی' دانتوں پر دنداسہ ملتی' سر پر دوپٹے کے نام پر ایک کالی چنی رکھتی اور بلا روک ٹوک سارے گاؤں کا دورہ

کرتی رہتی۔ پتہ نہیں اس کی شکل میں کوئی خاصیت تھی یا وہ واقعی اس کا اہتمام کرتی تھی کہ سارے گاؤں میں اس کا چہرہ ہر وقت صاف اور دھلا دھلا لگتا تھا۔ دیکھنے والے حیران تھے کہ ایسی خوبرو عورت کا اپنے سسرال میں کیوں ایک رات سے زیادہ گذارہ نہ ہو سکا اور وہ ہمیشہ کے لیے شادی کے تصور سے بدک گئی ہے۔

میراں بخش خود زندگی کی چوٹی سے گذر کر اب ڈھلان پر سفر کر رہا تھا' سر پر عموماً سفید ململ کی پگڑی لپیٹے رہتا اور سفید کھدر کا تہبند اور کرتہ پہنتا جو اس کی بیوی شریفاں گاؤں کے جولاہوں سے بنوایا کرتی تھی۔ اسے صرف ململ کا ٹکڑا بازار سے خریدنا پڑتا تھا' اور جب مالی حالات اس ٹکڑے کی خریداری کی اجازت نہ دیتے تو وہ گھر سے باہر نکلتے وقت شریفاں کا سفید دوپٹہ سر پر لپیٹ لیتا تھا تاکہ ذرا معزز لگے اسے اپنی عزت کا بہت خیال رہتا تھا۔ عموماً پرائے معاملوں میں ٹانگ نہیں اڑاتا تھا بلکہ اپنے معاملات میں بھی نرم خو اور صلح جو تھا اور زیادہ تر وقت اپنی نوکنال زمین کاشت کرنے اور پانچ وقت کی با جماعت نماز ادا کرنے میں صرف کرتا تھا۔ اس کے دو نوجوان بیٹے اسحاق اور فرمان علی ذرا تیز طبیعت کے تھے اور اکثر اپنے والد کو کوستے رہتے تھے کہ وہ کاشت کار ہو کر جولاہوں کی طرح ڈر ڈر کر' چھپ چھپ کر زندگی گذار رہا ہے لیکن میراں بخش اپنے لڑکوں کی بات بڑے تحمل سے سنتا اور شکر الحمد للہ' اللہ اکبر' تیری شان اللہ کریم' یا ایسے ہی الفاظ بول کر چپ ہو جاتا تھا۔ اس کی بیوی شریفاں بھی ایک نیک سیرت خاتون تھی جو نماز تو کم کم پڑھتی تھی لیکن نمازیوں سے زیادہ نیکی کے کام کرتی تھی اس کا محبوب ترین مشغلہ کبوتروں' کوؤں' چڑیوں اور دوسرے پرندوں کو دانہ ڈالنا تھا۔ وہ جب بھی آٹا پینے کے لیے گندم' مکئی یا باجرے کے دانے صاف کرتی تھی مٹھی دو مٹھی دانے الگ کر لیتی اور صاف غلہ چکی کے پاس رکھ کر پرندوں کی خوراک صحن میں بکھیر دیتی۔ چڑیوں کے جھنڈ کے جھنڈ رحمت کے فرشتوں کی طرح اس کے صحن میں اترتے اور دانہ دانہ چگنے لگتے وہ چکی کی ہتھی کو چلاتے ہوئے جب چڑیوں کو دانوں پر جھپٹتے دیکھتی تو بہت خوش ہوتی' اگر صحن میں بکھرے ہوئے دانے کم پڑ جاتے تو وہ

مٹھی بھر صاف دانے صحن میں پھینک دیتی' چڑیاں چوں چوں کرتی خوب ضیافت اڑاتیں' اور انہیں دیکھ کر شریفاں کی باچھیں کھل جاتیں۔ اگر کبھی شیداں اس فضول خرچی پر اعتراض کرتی تو شریفاں کا ایک ہی جواب ہوتا' یہ بھی ہماری طرح اللہ کی مخلوق ہے جو ہمیں دیتا ہے' وہی انہیں بھی دیتا ہے"

شریفاں کوؤں کو صحن میں نہیں اترنے دیتی تھی بلکہ ان کے حصے کی خوراک مکان کی چھت پر ڈال دیتی تھی۔ عموماً صبح سویرے' رات کی باسی روٹی کے ٹکڑے اکٹھے کرتی' انہیں توڑ توڑ کر چھوٹا کرتی اور پرات یا تھالی میں ڈال کر شیداں سے کہتی "لے اوپر ڈال آ" شیداں چھت پر رزق بکھیر کر واپس آنے کی بجائے سب سے اونچی سیڑھی پر دبک کر بیٹھ جاتی اور بھوکے کوؤں کو ٹکڑوں پر جھپٹتے اور آپس میں لڑتے دیکھتی رہتی۔ اتنے میں صحن کے دانے ختم ہو جاتے اور اکثر پرندے اپنا اپنا مقدر کھا کر اڑ جاتے لیکن بعض مانوس اور سوشل قسم کی چڑیاں پھدکتی پھدکتی شریفاں کی چکی کے پاس پہنچ جاتیں' ادھر ادھر گرا پڑا دانہ چگ لیتیں اور پھر شریفاں کی طرف منہ اٹھا کر دیکھنے لگتیں۔ شریفاں ایک ہاتھ سے چکی چلاتی اور دوسرے ہاتھ سے انہیں شفقت سے اڑا دیتی اور کہتی "جا لالچی کہیں کی' کل آنا' کل اشو اشو! اپنے اپنے گھر جاؤ اپنے گھونسلے اور انڈوں کا خیال کرو جا کر' شیطان کوے جگہ جگہ منڈلا رہے ہیں۔"

اس گھر کی دو خواتین شیداں اور مرجان بالکل ایک دوسری کی ضد تھیں۔ شیداں نو عمر تھی جس نے ابھی ابھی جوانی کی حدود میں قدم رکھا تھا اور اس بات کی منتظر تھی کہ کہاں اس کے والدین اس کا رشتہ دیتے ہیں اور بقیہ زندگی اکے کس بندے کے ساتھ گزارتی ہے' جب کہ مرجان جہاندیدہ خاتون تھی جو نہ صرف شب عروسی کے اسرار و رموز پا چکی تھی بلکہ روایتی شرم و حیا ترک کرکے بڑی آزادانہ گھومتی پھرتی تھی۔ گاؤں کے لوگ ایسی خواتین کے کرتوتوں کی بجائے ان کی چال ڈھال اور طرز گفتگو کو دیکھ کر ہی ان کے متعلق رائے قائم کر لیتے ہیں' اور مرجان جو ہر وقت بنی ٹھنی رہتی

تھی اور آزادانہ گاؤں کے مردوں سے گپ شپ لگاتی دیکھی گئی تھی' سارے گاؤں میں "شکاری" عورت مشہور ہو گئی۔ میراں بخش اور شریفاں کی مشترکہ شرافت بھی مرجان کو اس لقب سے نہ بچا سکی۔ منہ پر تو لوگ اسے کبھی چودھرانی' کبھی مرجان بی بی اور کبھی صرف بی بی کہتے لیکن پیٹھ پیچھے اسے مرجان شکارن ہی کہتے۔ مرجان کو خود بی بی' بیگم' خالہ' پھوپھی یا چاچی کہلانے سے چڑ تھی۔ اگر کوئی شخص اسے اس محترم رشتے سے پکار بیٹھتا تو وہ فوراً ڈانٹ دیتی اور کہتی "واہ رے' ماں کے دم چھلے میں تجھے ماسی لگتی ہوں؟ ماسی ہو گی تیری نانی' تیری چاچی' میں تو مرجان ہو' مرجان اگر نہیں پتہ تو سن لے مجھے ڈر سے لوگ مرجان شکارن کہتے ہیں اگر پھر ماسی کہا تو ایسا شکار کروں گی تیرا کہ کلیجہ نکال کر کھا جاؤں گی۔" سننے والا جواب دینے کی بجائے الٹا جھینپ جاتا اور منہ موڑ کر چل دیتا۔

مرجان کبھی کبھی شلوار کی بجائے تہبند باندھتی لیکن وہ بھی کالے رنگ کا اور جب وہ گلی گلی جوان مرغ کی طرح پنجوں کے بل چلتی تو عموماً دائیں ہاتھ سے تہبند کا ایک پلو پنڈلی تک اٹھا لیتی۔ کوئی کہتا کہ یہ تہبند کو مٹی سے بچانا چاہتی ہے جب کہ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ وہ راہ گیروں کو اپنی گوری پنڈلی دکھانا چاہتی ہے جو کالے تہبند کے ساتھ اور بھی گوری لگتی تھی۔ آنکھوں میں سرمے اور دانتوں میں دنداسے کے علاوہ اس کے چہرے پر صرف ایک زیور ہوتا تھا یعنی ناک میں سونے کا کیل یا تیلہ غالباً یہ واحد نشانی تھی جو اس نے شادی کے وقت سے ابھی تک اپنائی ہوئی تھی۔ ورنہ اب وہ شادی کو قصہ ماضی سمجھ کر اپنی کتاب زندگی سے یہ ورق پھاڑ چکی تھی۔ اگر اسے چھیڑنے کے لیے کوئی اسے شادی کا طعنہ دیتا تو وہ جھٹ جواب دیتی۔

"مجھ سے شادی کرنے کا اہل مرد ابھی تک پیدا نہیں ہوا ہے۔ تجھ میں ہمت ہے تو کر لے شادی مجھ سے!" یہ جواب سن کر طنز کرنے والا خود بخود میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا۔

یہ بھی مشہور تھا کہ گاؤں کا شاید ہی کوئی ایسا لڑکا ہو گا جو جوانی کی حدود میں قدم رکھے

اور مرجان سے بچ نکلے۔ ہر نا تجربہ کار نوجوان کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی بہانے اس کے ہتھے چڑھ جاتا اور وہ اسے اپنی لائن پر لے آتی لیکن تعلق چھ سات مہینے سے زیادہ نہ چلتا اور مرجان کسی نئے شکار کے پیچھے پڑ جاتی۔ وہ عموماً گلی میں چلتے چلتے سامنے سے آنے والے شخص کو روک لیتی' یونہی گپ شپ کے لیے۔ عورتیں تو اسے دیکھتے ہی راہ بدل لیتیں لیکن مرد اکثر اس کے ہتھے چڑھ جاتے۔ وہ کسی کا بازو پکڑ کر اور کسی کا کندھا تھام کر اسے ایک آدھ ڈائیلاگ سنا ڈالتی اور پھر اس کا رستہ چھوڑ دیتی اور آگے نکل جاتی۔

ایک دن گلابا اپنی بھیڑ بکریوں کا ریوڑ لے کر نکلا تو مرجان سے اس کا سامنا ہو گیا۔ اس نے کنی کترا کر نکلنے کی کوشش کی تو مرجان نے مردوں کی طرح ٹانگیں پھیلا کر تنگ گلی میں رستے روک لیا اور دائیں ہاتھ کی مٹھی میں اس کی سوکھی ہوئی ٹھوڑی پکڑ کر کہا "پہلے تو جاتے جاتے مجھے آنکھ مارتا تھا اور اب کنی کتراتا ہے' کمینہ کہیں کا! کیا میں اتنی بڈھی ہو گئی ہوں کہ اب آنکھ ملانے سے شرماتا ہے؟" گلابے نے ناں ناں کہتے دائیں بائیں دیکھا کہ کوئی آ تو نہیں رہا۔

مرجان نے اسے پریشان دیکھ کر ایک جھٹکے کے ساتھ اس کی ٹھوڑی کو چھوڑ دیا لیکن اس فیصلے کے ساتھ کہ "جا تجھے معاف کیا' نامرد کہیں کا!"

سنا ہے کہ مرجان آخری دم تک ایسی ہی رہی' غالباً وہ بد کاری سے عملاً دور رہتی تھی لیکن اس کا وتیرہ ایسا تھا کہ سب اسے بدمعاش ہی سمجھتے تھے۔ بھلا کالی شلوار یا کالے تہبند کے اوپر سفید پتلی قمیض' آنکھوں میں سرمہ' دانتوں پر دنداسہ اور ناک میں چمکدار کیل پہن کر مردوں سے ٹکر لینے والی عورت کو لوگ شریف زادی کیسے سمجھ لیتے!

میراں بخش کے دونوں بیٹوں میں سے اسحاق بڑا تھا اور فرمان علی چھوٹا! بڑا بیٹا کھیتی باڑی میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا' صبح صبح بھینس اور بیلوں کی جوڑی کو چارا ڈالتا' پانی پلاتا' بھینس سیر شکم ہو کر جگالی کرنے لگتی تو وہ بیلوں پر پنجالی ڈال کر انہیں کھیتوں میں

لے جاتا اور کنال کنال، دو دو کنال کے ٹیڑھے میڑھے کھیتوں میں ہل سے پتلی پتلی لکیریں ڈالتا رہتا۔ وہ تھک جاتا تو میراں بخش ہل تھام لیتا اور میراں بخش ہانپنے لگتا تو اسحاق ہل چلانے لگتا۔ وہ یوں باری باری ہل چلاتے رہتے اور ایک دوسرے کو ستانے کا موقع مل جاتا۔ لیکن بیلوں کی کمزور سی جوڑی کے لیے کوئی افاقہ نہیں تھا، وہ بے چارے خشک اور سخت زمین پر گھسیٹ گھسیٹ کر اپنے قدم رکھتے ہوئے ہل کھینچتے رہتے اور دل ہی دل میں سوچتے رہتے کہ کب نوجوان اسحاق سے میراں بخش ہل تھامے گا اور انہیں اسحاق کے کوڑوں سے نجات ملے گی۔ میراں بخش عموماً پیار پیار سے بیلوں کو ہانکتا تھا جبکہ اسحاق ڈنڈے برسا برسا کر انہیں تیز تر چلنے پر مجبور کرتا تھا۔ جب اسحاق ڈنڈا برسانے کے لیے ہاتھ ہوا میں لہراتا تو وٹ پر بیٹھا ہوا میراں بخش حقے کی نال چھوڑ کر چلا اٹھتا "آہستہ پتر، اسحاق! آہستہ، یہ بھی اس کی مخلوق ہیں۔" اسحاق کبھی میراں بخش کی نصیحت سن کر ہاتھ ہلکا کر دیتا اور کبھی بیلوں کی سست رفتاری سے تنگ آ کر جواب میں کہتا "بابا تجھے کسان نہیں، امام مسجد ہونا چاہیے تھا۔ ان پر لاٹھی یا ڈنڈا نہیں پڑے گا تو یہ یہیں رکوع اور سجدے میں چلے جائیں گے۔"

یوں دونوں باپ بیٹا صبح سے دوپہر تک بمشکل ایک کنال بارانی اور بنجر زمین میں ہل چلاتے اور باران رحمت کی امید پر اپنی دن بھر کی محنت اللہ کے رحم و کرم پر چھوڑ آتے۔ کبھی وقت پر بارش ہو جاتی تو دھرتی کا منہ ہرا ہو جاتا ورنہ ہل چلے کھیت پھٹے پھٹے منہ سے آسمان کی طرف دیکھتے رہتے۔

اسحاق نے کھیتی باڑی کے علاوہ ایک اونٹ بھی پال رکھا تھا جسے وہ مال برداری کے لیے استعمال کرتا تھا۔ شانتی نگر میں گاڑیاں تو صرف ملک صاحب کی حویلی یا فیکٹریوں میں تھیں، گاؤں والے تو گدھوں اور اونٹوں ہی پر گزارا کرتے تھے اور کمہاروں کے علاوہ کئی کاشتکاروں نے بھی اضافی آمدنی کے لیے، گدھے پال رکھے تھے۔ اینٹیں ڈھونے کے لیے، جہیز لانے اور لے جانے کے لیے، ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک بھوسہ یا ٹانڈے

منتقل کرنے کے لیے۔ گدھے والے گاؤں کے اندر آٹھ آنے فی پھیرا لیتے تھے' اور ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک ڈیڑھ یا دو روپے' لیکن اونٹ کا ریٹ زیادہ تھا۔ ایک تو وہ بوجھ زیادہ اٹھاتا' دوسرے گدھوں کی نسبت تیز رفتار تھا۔ گاؤں کے اندر اسحاق ایک پھیرے کے چار روپے لیتا تھا اور گاؤں سے باہر دس روپے۔ وہ ہر روز نہیں تو دوسرے چوتھے روز ایک آدھ پھیرا لگا لیتا تھا اور مہینے بھر میں اسی نوے روپے کمالیتا تھا۔

فرمان علی کو کھیتی باڑی سے دلچسپی تھی نہ بھاڑے کا اونٹ چلانے سے۔ اسے بس جان بنانے اور کشتی لڑنے کا شوق تھا۔ اسے کئی دفعہ شریفاں نے کہا کہ وہ کوئی کام بھی کیا کرے لیکن وہ ہر مرتبہ سنی ان سنی کر دیتا تھا اور زیادہ زور دیا جاتا تو گھر سے باہر نکل جاتا۔ وہ سورج طلوع ہونے سے ذرا پہلے جاگتا' اپنا میلا سا لنگوٹ' تیل کی شیشی اور تولیہ لے کر گاؤں سے باہر اینٹوں کے ویران بھٹے پر چلا جاتا۔ میراں بخش سو دفعہ کہتا "پتر' پہلے دو سجدے دیتا جا' پھر جہاں جی چاہے چلے جانا" لیکن وہ ان کی ایک نہ سنتا' بستر سے اٹھ کر سیدھا ورزش کرنے چلا جاتا جہاں وہ فضلو' رب نواز اور کرمداد کیساتھ "زور" کرتا۔ وہ لنگوٹ کس کر ایک دوسرے کے جسم پر سرسوں کا تیل ملتے' اکھاڑے میں ہلکی سی کدال چلا کر اسے نرم کرتے اور پھر ایک دوسرے کیساتھ گتھم گتھا ہو کر خوب ورزش کرتے اور آخر میں کنوئیں پر نہادھو کر واپس آ جاتے۔

وہ سب چار چار پانچ پانچ جماعتیں پڑھ کر ایک عرصے سے سکول چھوڑ چکے تھے اور پچھلے تین چار برس سے یہی شغل کر رہے تھے' ان کے مالی و سائل اچھی خوراک کھانے اور پہلوان بننے کی اجازت نہیں دیتے تھے لیکن وہ سوکھی روٹیاں کھا کر ہی اپنا شوق پورا کر لیتے تھے۔ فرمان علی کے گھر بھینس تھی اور وہ کبھی ماں سے مانگ کر اور کبھی اس سے چوری سیر آدھ سیر دودھ پی لیتا تھا۔ ایک دفعہ بھینس کا کٹا علی الصبح اپنے حصے سے زیادہ دودھ پی گیا۔ ہوا یوں کہ بھینس دودھ دوہنے سے پہلے ہی اپنا رسہ کھینچ

کر کٹے کے پاس یوں کھڑی ہو گئی کہ کٹے کا منہ اس کی پچھلی ٹانگوں کے درمیانی حصے تک پہنچ گیا اور اس نے پچھلے دونوں تھنوں سے دودھ پی لیا۔ جب میراں بخش دودھ دوہنے کے لیے بالٹی لیکر بیٹھا تو اسے اگلے دو تھن اکڑے ہوئے اور پچھلے دو مرجھائے ہوئے نظر آئے' پہلے تو اسے فرمان علی پر شک گذرا لیکن جب اس نے پچھلے تھنوں کو ہاتھ لگایا تو وہ دونوں گیلے تھے جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ کٹے کے منہ میں رہے ہیں۔ اگر فرمان علی نے دھاریں لی ہوتیں تو تھن خشک ہوتے۔

ایک دن شریفاں نے حسب معمول مٹی کی بڑی سی ہانڈی میں دودھ ڈال کر اپلوں کی دھیمی آنچ پر رکھ دیا اور خود کہیں باہر کام کے لیے چلی گئی۔ فرمان علی ورزش کرکے واپس آیا۔ گھر کو خالی پایا تو اس کا دھیان فوراً دودھ والی چاٹی کی طرف گیا۔ اس کا گلا خشک ہو رہا تھا اور سخت بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے باورچی خانے میں پڑی ہوئی گندم کا ایک تنا اٹھایا اور اسے دونوں طرف دانتوں سے کاٹا اور جب وہ پائپ کی شکل اختیار کر گیا تو اس میں پھونک مار کر اسے ٹیسٹ کیا پھر دودھ والی ہانڈی کا ڈھکنا اٹھایا تو دودھ کے اوپر بالائی کی گہری تہہ جم چکی تھی۔ اس نے پائپ سے تہہ کو پنکچر کیا اور پائپ اندر ڈال کر گرم گرم دودھ پینا شروع کیا' اور کم از کم سیر بھر دودھ پی کر دم لیا۔

بعد میں شریفاں نے دودھ کی تہہ نیچے بیٹھی دیکھی تو اسے شک گذرا کہ یہ ضرور فرمان علی کی شرارت ہے' لیکن وہ صاف مکر گیا' جب ماں نے سختی سے کہا دودھ نیچے کیسے چلا گیا تو اس نے جواب دیا امی' تم نے سائنس نہیں پڑھی اس لئے مجھ پر شک کر رہی ہو۔ میری طرح چند جماعتیں پڑھی ہوتی تو تمہیں پتہ ہوتا کہ دودھ کو آگ پر مسلسل رکھنے سے وہ بخارات بن کر اڑ جاتا ہے وہ تو اچھا ہوا کہ میں وقت پر آگیا اور اس کا ڈھکنا کس کر بند کر دیا ورنہ تمہارے آنے تک ہانڈی خالی ہو چکی ہوتی۔

"شیطان کہیں کا!" شریفاں یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔

ورزش کرنے اور دودھ پینے کے بعد فرمان علی اپنی چوپال پر جا بیٹھتا۔ فضلو' رب نواز اور کرم داد بھی آ جاتے اگر فرصت ہوتی تو گاؤں کے اور کئی بیکار نوجوان بھی شامل ہو جاتے منیرا' یونس کالیا اور بھا بشیر! وہ عموماً بڑ کے چھتنار درخت کے نیچے ڈیرا لگاتے۔ دو تین چارپائیاں' ایک آدھ حقہ اور دو تین چٹائیاں وہاں کا کل ساز و سامان ہوتا۔ تماشائی چارپائیوں پر اور پانسہ اور بارہ گاٹیاں کھیلنے والے زمین پر بیٹھ جاتے۔ آنے جانے والے لڑکے کھلاڑیوں کے پیچھے آکھڑے ہوتے' دو چار چالیں دیکھتے اور پھر اپنی راہ لیتے فرمان علی' فضلو' رب نواز' یونس کالیا اور بھا بشیر دیر تک کھیلتے رہتے۔ کئی دفعہ تو بازی ایسی جمتی کہ بڑ کا سایہ بھی سرک جاتا اور ان پر' دھوپ آجاتی لیکن وہ کھیل سمیٹنے کی بجائے دھوپ کیساتھ ساتھ سرکتے جاتے اور ظہر یا عصر تک کھیلتے رہتے اسی دھن میں کبھی وہ دوپہر کا کھانا بھی بھول جاتے اور کبھی لسی اور تندوری روٹیاں وہیں منگوا کر پیٹ بھر لیتے۔

ملک صاحب کو ان غریب مگر صحت مند اور باغیرت نوجوانوں کے یہ چونچلے قطعاً ناپسند تھے۔ انھوں نے ایک دفعہ اپنے ملازم پھتو کے ہاتھ میراں بخش کو پیغام بھجوایا کہ وہ اپنے بیٹے فرمان علی اور اس کے ہم جولیوں کو سمجھا دے کہ وہ اس طرح لنگوٹ کس کر بھٹے پر نہ آیا کریں اس سے خواہ مخواہ اشتعال انگیزی ہوتی ہے وہ کس کو رعب دینا چاہتے ہیں' انہیں باز رکھو۔ میراں بخش یہ ساری بات پی گیا۔ اس نے لڑکوں کو ملک جابر علی خان کے پیغام کے متعلق کچھ نہ بتایا اور مناسب موقع کی تلاش میں رہا' ایک دن جب فرمان علی' فضلو اور رب نواز اچھے موڈ میں گھر کے صحن میں بیٹھے تھے اور شیداں ان کے لیے چائے بنا رہی تھی تو میراں بخش نے انہیں سمجھایا کہ وہ صبح صبح بھٹے پر نہ جایا کریں۔ فرمان علی فوراً بول اٹھا۔

"کون منع کر سکتا ہے ہمیں وہاں جانے سے؟"

"کوئی نہیں روک سکتا بیٹا تم لوگوں کو بس......."

رب نواز نے کہا۔

"چاچا' کس نے اعتراض کیا ہے اس پر؟"
"نہیں' کون اعتراض کرے گا؟ بس ادھر صبح صبح گاؤں کی بہو بیٹیاں پانی بھرنے جاتی ہیں۔ تم لوگ اگر گاؤں کے مغربی جانب مہاجروں والی زمین کی طرف چلے جایا کرو تو کیا حرج ہے؟"

فضلو بولا "تایا جی' وہاں کنواں نہیں ہے' ہم نہائیں گے کہاں؟"
میراں بخش نے کہا۔ وہاں کنواں ہے پتر۔ ذرا ویران پڑا ہے جب سے ہندو گئے ہیں کس نے اسے استعمال نہیں کیا۔"
"لیکن وہ تو پلید ہے!"
"سب مل کر اسے پاک کر لو بیٹا! سو مٹکے پانی ہی تو باہر پھینکنا ہے! تم سب گبھرو جوان ہو' ہمت کرو' کنواں صاف کر دو' اس کا پانی پاک کر دو اور بھٹے والا کنواں اپنی ماؤں بہنوں کے لیے چھوڑ دو۔"
وہ سب مان گئے' اور انھوں نے بھٹے والے کنوئیں پر جانا چھوڑ دیا۔

ملک جابر علی خان کے چھوٹے دو بیٹے ان کی نظر میں بالکل بیکار تھے۔ قدیر سے چھوٹا شعیب علی خان تھا جسے بچپن ہی میں پولیو نے معذور کر دیا تھا۔ اندرون ملک اور بیرون ملک طویل علاج معالجے کے باوجود اس کا نچلا دھڑ بیکار ہو چکا تھا۔ اگرچہ ملک صاحب نے اسے بھی کالج میں تعلیم دلوائی تھی لیکن وہ نفسیاتی طور پر زندگی کی ہماہمی میں کبھی شریک نہ ہو سکا بلکہ اپنی معذوری کو خدا کی طرف سے ایک اٹل حقیقت سمجھتے ہوئے دین کی طرف جھک گیا تھا۔ اس نے بلوچستان کے بگتی سرداروں کی طرح داڑھی اور مونچھیں بڑھا رکھی تھیں لیکن اس سے اس کے جسم کے نچلے حصے کی معذوری کی کسی طور پر تلافی نہ ہوتی تھی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ملک صاحب نے اسے جائیداد کے حساب کتاب پر لگا رکھا تھا اور وہ گھر بیٹھے بیٹھے منشی کے تیار کردہ کھاتوں کو چیک کرتا رہتا تھا' لیکن کھاتوں سے اس کا تعلق صرف زرعی اجناس اور ان سے ہونے والی

آمدنی کے اعداد شمار گننے تک محدود تھا۔ اسے قطعاً یہ اختیار نہ تھا کہ وہ کسی لین دین میں زبان کھول سکے یا کسی سودے پر تبصرہ کر سکے۔ وہ سٹیشنری کے سامان کی طرح

ہر وقت سٹیشنری میں الجھا رہتا تھا۔
حویلی کی تاریخی اہمیت اور موجودہ جاہ و حشمت کو دیکھ کر دیپالپور کے ایک زمیندار گھرانے نے شعیب کے لیے رشتہ بھی دیدیا تھا اور ملک صاحب نے اپنی خاندانی روایت کے مطابق شادی بھی بڑی دھوم دھام سے کی تھی لیکن شعیب کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ کمی شعیب میں ہے' مسز شعیب میں نہیں۔ مسٹر شعیب اور مسز شعیب دونوں ہی سر تسلیم خم کر چکے تھے۔ شعیب اپنی لا علاج معذوری کے سامنے اور مسز شعیب اولاد کے عوض بے تحاشا زیوروں' کپڑوں اور کاروں کے سامنے!
جسمانی معذوری کے بعد اولاد کی محرومی نے شعیب کو حویلی اور اس کے مکینوں سے الگ تھلگ کر دیا تھا وہ ملک صاحب کے گھر کا واحد فرد تھا جو باقاعدگی سے نماز پڑھتا تھا اور اس کے بھائی اس کی اس عادت کو سراہنے کی بجائے اس کا مذاق اڑاتے تھے اور کہتے تھے کہ اپاہج شخص مصلے پر نہیں بیٹھے گا تو کیا گھوڑے پر بیٹھے گا۔
شعیب گھوڑے پر تو سوار نہ ہو سکتا تھا البتہ نوکروں اور بیساکھیوں (دونوں میں زیادہ فرق نہ تھا) کی مدد سے کھلے دروازوں والی جیپ میں سوار ہو جاتا تھا اور حسن ڈرائیور اسے اس کی مرضی کے مطابق کبھی چپ شاہ کی خانقاہ پر اور کبھی بابا بہشتی کے ڈیرے پر لے جاتا تھا۔
چپ شاہ کی خانقاہ شانتی نگر کے جنوب مغربی کنارے پر واقع تھی جہاں گاؤں والے اپنی امیدیں' حسرتیں اور خواب نذرانوں کی شکل میں لے کر حاضر ہوتے تھے۔ شانتی نگر کے علاوہ علاقے کے دوسرے گاؤں والے بھی اپنی پیاس اسی کنوئیں پر بجھانے آتے تھے۔ وہ روحانیت پانے' مغفرت کی دعا منگوانے یا جنت میں سیٹ الاٹ کروانے نہیں آتے تھے' وہ تو آتے تھے بس زندگی کی روز مرہ رکاوٹیں پار کرنے اور سکھ کے ذرائع تلاش کرنے! جس طرح لوگ چار آٹھ آنے دے کر تنور پر بیٹھی ہوئی ماچھن سے دو چار

روٹیاں لے لیتے تھے' اس طرح یہ گرے پڑے انسان مرغ' گھی' ریشمی چادریں یا کرنسی نوٹوں کے ہار چپ شاہ کے مزار پر چڑھا کر اس کے قدموں میں بیٹھ جاتے تھے اور گڑ گڑا کر اپنی چھوٹی موٹی خواہشوں کی تکمیل کے لیے دعائیں مانگتے رہتے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ میرے بیمار بیل کو ٹھیک کر دے' کوئی واسطہ دیتا تھا کہ میری بھینس کو شیر دار بنا دے' کوئی عرض کرتا کہ میری بیوی کا بخار اتار دے اور کوئی دعا مانگتا تھا کہ میرے جوان پتر کے روز گار کا کوئی وسیلہ بنا دے۔ پتہ نہیں شعیب یہاں آکر کیا مانگتا تھا لیکن وہ ہر قمری مہینے کی پہلی جمعرات کو وہاں ضرور جاتا تھا۔ جیپ اسے خانقاہ کے بیرونی دروازے پر چھوڑ آتی تھی اور وہ بیساکھیوں کی مدد سے اپنا نیم مردہ جسم (جس کا اوپر والا دھڑ نسبتاً بھاری تھا) گھسیٹتے ہوئے مزار تک پہنچ جاتا اور بیساکھیوں سے ٹیک لگا کر مزار پر جھک جاتا تھا۔ وہاں سے خاک اٹھا کر اپنے چہرے اور جسم پر پھیر لیتا تھا اور پھر دونوں بیساکھیوں کو دیوار کیساتھ پہلو بہ پہلو لٹا کر خود پھوہڑی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا تھا عموماً کندھے سے لٹکی ہوئی چادر اتار کر سر پر اوڑھ لیتا تھا اور چادر کے اس چھوٹے سے گنبد میں بیٹھ کر پیر صاحب سے لو لگا لیتا تھا وہیں نماز پڑھتا' وہیں ورد کرتا' وہیں دعائیں مانگتا اور وہیں چپ شاہ کے مزار کے سامنے پہروں چپ چاپ بیٹھا رہتا۔

پتہ نہیں وہ کیا مانگتا ہو گا۔ شاید اپنی جسمانی معذوری سے نجات مانگتا ہو گا۔ شاید اولاد کی بھیک مانگتا ہو گا' شاید وہ اپنی خوشیوں کے لیے گڑ گڑاتا ہو گا لیکن اس کے رویے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ گاؤں والوں کی حالت بدلنے یا ملک جابر علی خان کے جبروت کے بت ٹوٹنے کی دعا ہر گز نہیں مانگتا تھا۔ شعیب کے علاوہ بہت سے لوگ چپ شاہ کے مزار پر حاضری دیتے تھے لیکن وہ عموماً دن کے وقت آتے' اپنا اپنا سودا کرتے' کچھ نقد ادائیگی کرتے اور کچھ منت پوری ہونے پر ادا کرنے کا وعدہ کر کے چلے جاتے لیکن رات کو چھ مستقل مجاوروں کے سوا وہاں کوئی نہ ٹھہرتا تھا۔ مہینے میں ایک مرتبہ جب پہلی جمعرات کی چاندنی میں شعیب وہاں پہنچتا تو سارے مجاور جان جاتے کہ وہ یہیں چاندنی کو ڈوبتے

اور تاریکی کو گہرا ہوتے دیکھے گا اور صبح کے وقت صندوقچی میں سو روپے کا تہہ شدہ نوٹ ڈال کر جیپ میں بیٹھ کر چلا جائے گا جیسے مسافر شب باشی کا کرایہ ادا کر کے چلے جاتے ہیں۔

بابا بہشتی کا ڈیرا نہ صرف چپ شاہ کی خانقاہ کے مخالف سمت یعنی شانتی نگر کے شمال کی طرف واقع تھا بلکہ وہاں کا سارا رنگ ہی مختلف تھا۔ ملک صاحب کی زمینیں اور باغات حویلی کے شمال کی طرف کوئی ایک میل تک پھیلے ہوئے تھے اور ان کے دائیں جانب دریا بہتا تھا۔ ملک جابر علی کی زمین اور دریا کے کنارے کے سنگم پر ایک اونچا سا ٹیلہ تھا جہاں کبھی دریا بہتا تھا لیکن اب وہاں سے پانی ذرا کروٹ لے کر گزرتا تھا۔ اس ٹیلے کے اوپر بابا بہشتی کی جھونپڑی تھی۔ کچی جھونپڑی جس کی چھت لکڑی کے چھوٹے چھوٹے شہتیروں' جنگل سے کاٹے ہوئے ڈنڈوں' ٹین کے ٹکڑوں اور دوسری ایسی ہی چیزوں سے بنائی گئی تھی۔ ملک صاحب کی حویلی تو بہت مضبوط تھی لیکن یہ جھونپڑی بڑی کمزور لگتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اگر کبھی طوفان آیا یا دریا نے چھل مارا تو بابا کی ساری کائنات درہم برہم ہو جائیگی لیکن پرانے لوگ گواہ تھے کہ انہوں نے بابا کی کٹیا' شروع سے اسی حالت میں دیکھی تھی۔ نہ کبھی جھکی نہ اجڑی' نہ بڑھی نہ سکڑی' بس جوں کی توں!

بابا بہشتی کی جھگی والے ٹیلے سے نیچے پانی کی جھیل تھی جو موسم برسات میں دریا کے پانی سے اٹ جاتی تھی لیکن سال کے باقی دس مہینے جھیل کا کام دیتی تھی۔ باب بہشتی کے بہت سے کام اسی جھیل سے چلتے تھے۔ وہ اسی جھیل کا نتھرا ہوا پانی پرانی مشک میں بھر کر اوپر اپنی جھونپڑی میں لے آتا تھا اور ہر روز اسی جھیل سے ایک مچھلی پکڑ کر بھون لیتا تھا۔ اگر اچھے موسم میں دو یا تین مچھلیاں ہاتھ آجاتیں تو وہ ضرورت کی ایک مچھلی کپڑے میں لپیٹ کر گھر لے آتا اور باقی مچھلیاں وہیں جھیل میں واپس ڈال دیتا۔ مچھلیاں پکڑنے کے لیے اس کے پاس کوئی جال یا کنڈی وغیرہ نہ تھی بس وہ صبح نماز

اور تلاوت کے بعد چھوٹی سی خشک مشک (بلکہ مشکیزہ) پیٹھ پر ڈالتا آہستہ آہستہ اللہ کے نام کا ورد کرتا' جھیل کے کنارے جاپہنچتا' احتیاط سے مشکیزے میں پانی بھرتا پھر گھٹنوں تک تہبند اٹھا کر کمر سے کس لیتا اور آہستہ آہستہ اٹھاتے ہوئے جھیل میں اتر جاتا۔

بظاہر یہ جھیل بالکل بانجھ لگتی تھی لیکن اس کے کسی نہ کسی گوشے سے وہ پہلی یا دوسری کوشش میں ایک آدھ مچھلی یوں نکال لیتا جیسے قدرت نے اس کے لیے من و سلویٰ سنبھال کر رکھا ہو کہ جب بابا بہشتی آئے گا تو اپنا قرض وصول کرلے گا۔

بابا بہشتی کی گزر اوقات صرف مچھلی پر نہ تھی' اس نے اپنی جھونپڑی کے آگے ایک سرسبز و شاداب صحن بنا رکھا تھا جس کے اردگرد خاردار خشک ٹہنیوں کی باڑ تھی اور اس کے اندر بہت سے پودے لگے ہوئے تھے جن میں سب سے نمایاں کیلے کے درخت تھے' یہ درخت دوسرے پودوں سے تو اونچے تھے لیکن پھل کبھی نہیں دیتے تھے'ویسے ہی پھوکے تنے پر پھیلے ہوئے چوڑے پتے' کسی نہ کام کے! لیکن پھر بھی بابا بہشتی مشکیں بھر بھر کر انہیں پانی دیتا اور اللہ تعالیٰ کا شکرادا کرتا۔ صحن میں موسم کے مطابق چھوٹی موٹی فصل اور چند ایک سبزیاں اگالیتا اور تقریباً سارا سال ہی چٹنی کے لیے پودینہ' ٹماٹر یا دھنیا دستیاب رہتا۔ وہ شاذ و نادر ہی ہانڈی پکاتا تھا اور روکھی سوکھی روٹی کبھی چٹنی اور کبھی پانی کیساتھ کھا لیتا۔ زیادہ عیاشی کے موڈ میں ہوتا تو جھیل سے ایک آدھ مچھلی لاتا اور اللہ کا شکر ادا کرتا۔

وہ کسی سے کچھ نہیں مانگتا تھا البتہ گاؤں والے دوسرے چوتھے دن اسے کچھ نہ کچھ زبردستی دے جاتے۔ کھیر کی پلیٹ' سالن کا پیالہ' دہی کا کٹورا یا دودھ کا چھنا۔ کبھی کبھی وہ پلاؤ اور گوشت' بھنا ہوا مرغ یا چلتاپھرتا بکرا لے آتے لیکن وہ ایسی چیزیں بڑے اصرار سے واپس کردیتا اور صرف معمولی معمولی چیزیں مثلاً دال کا کٹورا' کھیر کی پلیٹ یا دہی کاچھنا قبول کر لیتا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ بابا بہشتی کون ہے' کہاں سے آیا اور یہاں کیوں برسوں سے ڈیرا ڈالے ہوئے ہے۔ اس لحاظ سے بابا بہشتی چپ شاہ سے بھی زیادہ چپ تھا' کبھی کسی سے اپنے متعلق بات نہیں کرتا تھا' کہتا تھا "میں" کو چھوڑو' "اس" کی بات کرو۔ لوگ اس کے جواب کو معرفت کی باتوں پر محمول کرتے اور واہ واہ کر کے بابا بہشتی کو روحانی پیر کا درجہ دینے لگتے لیکن وہ ہمیشہ کہتا "پترو! مجھ جیسے گناہ گار کو روحانیت میں مت گھسیٹو میں نے تو روحانیت کے دروازے پر اپنے گناہوں سے خار دار باڑ لگا رکھی ہے' میں وہاں کیسے داخل ہو سکتا ہوں۔" اگر کوئی حاجت مند اس سے کچھ مانگتا تو وہ سادگی سے کہہ دیتا "بیٹا میرے پاس دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ میرا اپنا دامن خالی ہے اس تار تار دامن میں کوئی چیز کیسے ٹھہر سکتی ہے جو میں دوسروں کو دے سکوں۔ "اس سے مانگو! اس سے وہی دینے والا ہے۔ اپنے لئے بھی مانگو' میرے لئے بھی مانگو' دوسروں کے لیے بھی مانگو' وہی دے گا۔" لوگ اس کی باتوں کو اس کی عاجزی اور کسر نفسی گر دانتے اور داد دیتے کہ واہ واہ معرفت کا درجہ ہو تو ایسا کہ انسان اپنے آپ کو بھول جائے اور ہر چیز کو "اس" میں فنا کر دے۔ بابا بہشتی ایسے عقیدت مندوں کو لاکھ منع کرتا کہ شرکت مت کرو' مجھے اس سے مت ملاؤ لیکن لوگ بھی کہاں باز آنے والے تھے' وہ تو جس کے پیچھے پڑ جائیں اسے یا تو شیطان ثابت کرکے چھوڑتے ہیں یا فرشتہ' انسان تو رہنے ہی نہیں دیتے!

بابا بہشتی کے متعلق دو تین روایتیں مشہور تھیں ایک یہ کہ کسی خدار سیدہ پیر نے اسے اس علاقے میں ڈیوٹی پر مامور کر رکھا ہے کہ وہ یہاں ہر چیز کا خیال رکھے۔ لوگوں کے سامنے آ کر نہیں' ان کے سامنے تبلیغ کر کے نہیں' انہیں جنت کا لالچ دے کر یا دوزخ سے ڈرا کر نہیں بلکہ اللہ کی رحمت کی چھتری پھیلا کر تا کہ لوگوں کو پتہ ہی نہ چلے کہ ان کا محسن کون ہے اور وہ ان پر کونسا احسان کر رہا ہے کیونکہ پیر صاحب کی ہدایت تھی کہ اگر احسان اور احسان کرنے والے کی شناخت ہو جائے تو احسان بھی

ختم ہو جاتا ہے اور محسن بھی محسن نہیں رہتا۔

دوسری روایت یہ تھی کہ وہ کسی دور دراز کی جیل سے بھاگا ہوا قیدی ہے جو بستی سے دور الگ تھلگ رہتا ہے اور اس نے ڈاڑھی اور سر کے بال بہروپ بھرنے کے لیے بڑھا رکھے ہیں لیکن پولیس بھی بڑی تیز ہوتی ہے وہ یقیناً کسی نہ کسی دن اس کا کھوج لگاتے لگاتے وہاں پہنچ جائے گی اور اس کا بہروپ نوچ کر لوگوں کو اس کا اصل روپ دکھا دے گی۔

تیسری روایت یہ تھی کہ وہ دشمن کا جاسوس ہے جو سادگی' خدا ترسی اور عبادت کے ذریعے دشمن کو خفیہ معلومات فراہم کرتا ہے۔ پچھلی جنگ میں بعض مشٹنڈوں نے تو اس شک میں پولیس کو خبر کر دی تھی اور وہ اسے پکڑ کر بیٹھ بھی گئے لیکن انہیں اس کے جسم کے کپڑوں کے اندر سے نہ کوئی کاغذ کا پرزہ ملا اور نہ جھونپڑی سے وائرلیس سیٹ وہاں تو ایک قرآن شریف' ایک پنج سورہ' ایک تسبیح ایک کالے پیندے والی دیگچی' ایک چٹنی کوٹنے والی سل اور ایک خشک مشکیزہ ملا۔ وہ مایوس ہو کر واپس چلے گئے اور بابا بہشتی کو رہا کر دیا گیا۔

شعیب جیپ پر بیٹھ کر یہاں ہفتے میں دو تین مرتبہ ضرور آتا اور بابا بہشتی کے پاس سارا سارا دن بیٹھا رہتا۔ اگرچہ وہاں ایک ٹیڑھی میڑھی چارپائی بھی تھی لیکن وہ دونوں عموماً چٹائی پر بیٹھتے اور دھوپ یا سائے' گرمی یا سردی' صبح یا شام کی پروا کئے بغیر باتیں کرتے رہتے۔ اللہ اور اس کے رسول کی باتیں' دریا کے چڑھنے اور اترنے کی باتیں' ملک جابر علی خان کے غصے اور رحم کی باتیں' فصلوں کے پھلنے اور کٹنے کی باتیں' گاؤں کے بڑوں اور چھوٹوں کی باتیں۔ ان باتوں میں کوئی معرفت یا حکمت کی بات نہ ہوتی' کسی کے خلاف کسی قسم کوئی بات نہ ہوتی' نہ ملک صاحب کے جبر کی نہ گاؤں والوں کے صبر کی' نہ پرویز کی خاموش تابعداری کی اور نہ قدیر کی دلیل بازی کی۔ بس وہ دونوں آپس ہی میں باتیں کرتے رہتے اور ایک دوسرے سے سکون حاصل کرتے رہتے۔ شاید

ایسی گفتگو جو تلخی' کدورت' نفرت اور غیبت سے پاک ہو خود بخود سکون کا باعث بنتی ہے۔ اور شعیب اپنا فالج زدہ دھڑ ٹھیک کروانے یا اولاد کی نعمت سے سرفراز ہونے کی بجائے اسی سکون کی تلاش میں یہاں آتا تھا کیونکہ حویلی میں ایسی فضا میسر نہ تھی۔ وہاں کی تو کائنات ہی الگ تھی۔ دولت' رعب' دبدبہ! یہاں حلم ہی حلم! خاکی انسان کو خاک سے پیوست ہونے کا عزم!

ملک جابر علی خان کو اپنے سب سے چھوٹے بیٹے ۲۲ سالہ ضمیر علی خان سے سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ وہ ضرورت سے زیادہ پڑھ گیا ہے۔ وہ اکثر اپنے ہم مرتبہ دوستوں سے کہتے کہ ایک کو قدرت نے پولیو سے معذور کر دیا اور دوسرے کو بے مقصد اعلیٰ تعلیم نے بے کار بنا دیا۔ اب تو گذارا پرویز اور قدیر سے کرنا ہوگا۔ وہی اس حویلی کا مستقبل ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں نیک اور فرمانبردار رکھے۔

ضمیر کو ملک جابر علی خان نے اچھے اچھے اداروں میں تعلیم دلوائی' کھلا پیسہ دیا' سکول اور کالج میں سب سے زیادہ خوشحال رکھا بلکہ سب سے چھوٹا اور لاڈلا ہونے کی وجہ سے اسے ایک چھوٹی سے فوکس ویگن بھی لے دی تاکہ وہ کالج میں گھوما پھرا کرے' جہاں چاہے جائے' دوستوں کو سیر کرائے لیکن کالج کے زمانے میں ضمیر نے کار کی سہولت کبھی استعمال نہ کی وہ اسے پٹی بورژوا (PETTY BOURGEOIS) حرکت کہتا اور ناک منہ چڑھا کر کافی ہاؤس میں جا بیٹھتا جہاں وہ اپنے ہم خیال دانشوروں سے علمی و ادبی بحثیں کرتا' تازہ کتابوں کے حوالے دیتا' معروف اور غیر معروف فلاسفروں کے افکار بیان کرتا اور اپنا نقطہ نظر منوانے کے لیے وزنی دلیلیں پیش کرتا اور اگر مزید وزن کی ضرورت محسوس ہوتی تو وزنی میز پر وزنی مکا مارتا...... اور اپنے حریف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگتا۔ وہ میز پر عموماً بحث جیت جاتا۔

ملک صاحب چاہتے تھے کہ وہ سائنس مضامین کے ساتھ گریجوایشن کرے اور پھر ایک سائنسی تحقیقی ادارہ قائم کرے جس میں زرعی شعبے میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ماہرین اور تجربہ

کار عملہ ہو اور ملک صاحب کو زرعی ترقی کے لیے مشورہ دے سکے۔ ضمیر کو اس منصوبے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

اس نے ملک صاحب کا یہ منصوبہ نا کام بنانے کے لیے ایک نیا منصوبہ بنایا۔ ملک صاحب کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ کالج جاتے' متعلقہ لیکچرار یا پرنسپل سے ملتے یا ضمیر کے اندر پیدا ہونے والے ذہنی انقلاب سے با خبر رہتے وہ تو یہی سمجھتے کہ جس کسی کو اس کی ضرورت کے مطابق...... بلکہ بعض اوقات اس کی ضرورت سے بڑھ کر...... پیسہ دے دیا جائے تو وہ زر خرید غلام بن جاتا ہے۔ انہوں نے یہی رویہ اپنے تینوں بیٹوں' بہوؤں اور اپنی دونوں بیویوں سے اپنا رکھا تھا لیکن ضمیر کے معاملے میں ان کا فارمولا کام نہ آیا۔ اس نے ملک صاحب کو تو کہہ دیا کہ وہ بی ایس سی کر رہا ہے لیکن درحقیقت اس نے اپنے پسند کے مضامین اکنامکس اور فلاسفی لے رکھے تھے اور وہ انہیں مضامین سے متعلق مباحث میں حصہ لیتا رہا اور خاصا طاق ہو گیا۔ فائنل امتحان دینے کے بعد ملک صاحب نے جب اسے مزید تعلیم کا ارادہ ترک کرنے اور عملی زندگی میں ان کا ہاتھ بٹانے کا مشورہ دیا تو وہ ٹال گیا' ذرا دباؤ پڑا تو گھر سے اچانک غائب ہو گیا۔ ایک خیال یہ تھا کہ وہ نظریاتی لحاظ سے منحرف لڑکوں کے ساتھ مل کر سرحد پار چلا گیا ہے اور دشمن کے ہتھے چڑھ گیا ہے جو اسے تخریب کاری کی تربیت دے رہے ہیں۔ دوسری اطلاع یہ تھی کہ وہ کسی یورپی ملک میں اعلیٰ تعلیم کے لیے چلا گیا ہے جہاں وہ دن کے وقت یونیورسٹی میں پڑھتا ہے اور رات کو چھوٹی موٹی نوکری کرتا ہے۔ ملک صاحب کو اس کی گم شدگی پر کوئی تشویش نہ تھی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ بالغ ہے' سمجھ دار ہے' اغوا تو نہیں ہوا' خود ہی دوستوں کے ساتھ کہیں نکل گیا ہو گا واپس آ جائے گا۔ لیکن وہ دو سال تک واپس نہ آیا اور نہ اس نے کوئی خط ہی لکھا یا رابطہ قائم کیا۔

ملک صاحب نے ادھر ادھر سے پتہ کرایا تو انہیں خبر ملی کہ وہ اعلیٰ تعلیم کا دلی شوق

رکھتا تھا اور کسی دوست سے گلہ کر رہا تھا کہ ملک صاحب اس کے شوق کو دبا دیں گے لہٰذا اس کا ارادہ تھا کہ وہ چپکے سے پاسپورٹ بنوا کر لندن یا یورپ کے کسی دوسرے شہر میں چلا جائے جہاں وہ معاشیات یا فلسفے میں یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرے۔ ملک صاحب کو یہ صدمہ تو ضرور ہوا کہ ان کا ایک بیٹا نا فرمان نکلا اور ان کی گرفت سے نکل گیا لیکن وہ یہ سوچ کر خاموش ہو گئے کہ سال دو سال ٹھوکریں کھائے گا تو خود بخود واپس آجائے گا' ساری دانشوری ہرن ہو جائے گی اور وہ دوبارہ ان کے پاؤں پکڑ لے گا۔

پھر ایک دن اخبار میں اچانک خبر چھپی کہ ۱۵ لڑکوں پر مشتمل تخریب کاروں کا ایک گروہ چمن کے راستے بلوچستان میں داخل ہوتے ہوئے پکڑا گیا ہے جن میں اکثر پڑھے لکھے اور کھاتے پیتے گھرانوں کے چشم و چراغ ہیں۔ ملک صاحب خود ادر دو کا اخبار پڑھنا اپنے اسٹیٹس (STATUS) کے منافی سمجھتے تھے اور یہ خبران کے مربعوں کے کھاتہ دار منشی لال دین نے پتلے فریم اور سفید شیشوں والی پرانی عینک لگا کر سنائی۔ پہلے تو انہوں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہ کی لیکن جب منشی لال دین نے انہیں بتایا کہ اگر تفتیش کے دوران یہ انکشاف ہو گیا اور یہ بات اخبارات میں آگئی کہ ان گمراہ لڑکوں میں سے ایک لڑکا ملک جابر علی خان شانتی نگر کے جاگیردار کا بیٹا ہے تو نہ صرف ان کی شان میں فرق آئے گا بلکہ عین ممکن ہے کہ ان کے ساتھ حکومت اور انتظامیہ کا رویہ بھی بدل جائے۔ یہ بات ملک صاحب کے دل کو لگی اور انہوں نے اپنے طور پر....... ذاتی اثر و رسوخ اور رشوت کے ذریعے....... اس بات کا کھوج لگانا شروع کر دیا کہ گرفتار شدگان میں ضمیر نامی کوئی لڑکا ہے یا نہیں۔ اتفاق سے احتشام علی جو کچھ عرصہ پہلے تک شانتی نگر سمیت اس علاقے کا پولیس کپتان اور اس حویلی کا نمک خوار رہا تھا' اب ترقی پا کر کوئٹہ میں ڈی آئی جی (پولیس) لگا ہوا تھا۔ اس نے ملزمان کی فہرست چیک کرکے ملک صاحب کو تسلی دے دی کہ ان کا بیٹا ان میں نہیں ہے۔ ملک صاحب نے

سکھ کا سانس لیا۔

کچھ عرصے بعد ضمیر خوش و خرم واپس حویلی پہنچ گیا۔ اس نے دانشوروں کی طرح ڈھیلا سا شلوار کرتہ پہن رکھا تھا اور اوپر سے گرم چادر بائیں کندھے کے اوپر سے اور دائیں بازو کے نیچے سے اوڑھ رکھی تھی۔ حسب معمول اس کا چہرہ کلین شیو اور صاف ستھرا تھا جس پر سنہری فریم اور سفید شیشوں والا خوبصورت چشمہ سجا ہوا تھا۔ بال پہلے سے لمبے بلکہ بہت لمبے تھے اور اس کی گردن سے ہوتے ہوئے اس کی قمیض کے کالر پر چھائے ہوئے تھے' پاؤں میں براؤن جرابوں سمیت براؤن رنگ کا چپل پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں بجھا ہوا پائپ اور ولائتی تمباکو کا ڈبہ تھا۔ وہ حویلی کے گیٹ کے اندر ٹیکسی سے اترا' میٹر دیکھے بغیر پچاس روپے کا نوٹ اس کے حوالے کیا اور ٹیکسی والا سلام کرکے چلا گیا۔ حویلی کے ایک پرانے ملازم نے خوش آمدید کے چند الفاظ حیرت اور تشویش کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہے اور اس کے دو سوٹ کیس اٹھا کر اندر پہنچا دیئے' ایک میں استعمال کے کپڑے تھے اور دوسرے میں کتابیں۔

اس وقت گھر میں پرویز تھا نہ ملک صاحب' دونوں زمینوں پر گئے ہوئے تھے جبکہ قدیر انڈسٹریل کمپلکس میں مصروف تھا۔ گھر میں صرف شعیب تھا جو دھوپ میں بیٹھا منشی لال دین کے تیار شدہ کھاتے چیک کر رہا تھا۔ ضمیر سیدھا شعیب کے پاس چلا گیا جو اسے یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر بغلگیر ہونے کے لیے اٹھنے لگا لیکن نیچے کا دھڑ مفلوج ہونے کی وجہ سے اٹھ نہ سکا۔ اس نے سہارا لینے کے لیے بیساکھی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ضمیر نے آگے بڑھ کر اسے روک دیا "آپ تکلیف نہ کیجئے' بھائی جان" یہ کہہ کر ضمیر شعیب کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گیا اور دونوں بیٹھے بیٹھے نیم بغلگیر ہوگئے۔

شعیب ایک زمانے سے "بھائی جان" کے محبت بھرے الفاظ کو ترس گیا تھا۔ دوسرے دو بھائی نہ صرف عمر میں اسے بڑے تھے بلکہ لحاظ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھتے تھے اور اس سے گھاس نہیں ڈالتے تھے۔ ضمیر پورے گھرانے میں واحد فرد تھا جو شعیب کی

معذوری کی وجہ سے اس کا مذاق اڑانے کی بجائے اس کے ساتھ غیر معمولی محبت اور احترام کے ساتھ پیش آتا تھا۔

وہ دو بچھڑے ہوئے دوستوں کی طرح خاصی دیر تک گپ شپ لگاتے رہے۔ شعیب نے اپنے روزمرہ معمولات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ وہ ملک صاحب کی سونپی ہوئی ڈیوٹی یعنی لیجر (LEDGER) چیک کرنا بڑی خوش اسلوبی سے ادا کرتا ہے' کچھ وقت اپنی بیوی زبیدہ کے پاس گذارتا ہے اور جب اس کا جی گھبرانے لگتا ہے تو کبھی بابا چپ شاہ کے مزار پر چلا جاتا ہے اور کبھی بابا بہشتی کے ڈیرے کا رخ کرتا ہے۔ ضمیر نے کہا کہ وہ آئندہ جب ان مقامات پر جائے تو اسے بھی ساتھ لیتا جائے' اسے بھی روحانی سکون کی تلاش ہے۔

ضمیر نے اپنے دو اڑھائی سالہ غیر حاضری کے متعلق بتایا کہ بی اے کا امتحان دینے کے بعد چند دوستوں کے ساتھ بائی روڈ یورپ جانے کا پروگرام بنا۔ فیصلہ یہ کیا کہ بسوں پر سفر کریں گے' اپنا مختصر سارخت سفر خود اٹھائیں گے' رات سر راہ سراؤں میں گذاریں گے' اپنے کپڑے خود دھوئیں گے' اپنا کھانا خود تیار کریں گے یا تھرڈ ریٹ ہوٹلوں سے کھائیں گے اور زندگی کو قریب سے دیکھیں گے یہ کیا ہوا کہ کار سے اترے جہاز میں سوار ہو گئے' جہاز سے اترے تو ٹیکسی پر بیٹھ کر فائیو سٹار ہوٹل میں چلے گئے' سارا وقت مصنوعی گرمی و سردی اور مصنوعی روشنی میں گذار کر رات کو گھرے دبیز بستروں میں گھس گئے اور اگلے دن اعلیٰ قسم کے کافی ہاؤس یا میوزیم میں چلے گئے! زندگی کی صحیح حرارت تو زمین سے پھوٹتی ہے اور یہ ایک فلاسفر کے بقول کسی ملک کی SOUL (روح) انسانی پاؤں کے تلے (SOLE) کے ذریعے انسانی جسم میں سرایت کرتی ہے جو انسانی زمین پر قدم ہی نہیں رکھے گا وہ دھرتی سے روشناس کیسے ہو گا؟

ضمیر نے مزید بتایا کہ اس نے اٹلی پہنچ کر ایک دوست کو پاکستان فون کیا اور اپنے بی اے پاس کرنے کی خوشخبری سنی' ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ اگر ابا جی کو پتہ

چل گیا کہ میں نے بی ایس سی کی بجائے بی اے کیا ہے تو وہ بہت ناراض ہوں گے اور آگے پڑھنے کی ہر گز اجازت نہیں دیں گے' چنانچہ تار کے ذریعے یونیورسٹی سے اپنا رزلٹ منگوایا' بینک سے روپے نکلوائے' MONEY CHANGER سے فارن ایکسچینج حاصل کیا اور انگلستان چلے گئے وہاں انسٹیٹیوٹ آف فلاسفی میں داخلہ لے لیا' مزے سے دو سال فلسفہ پڑھا' جی بھر کر کتابوں کا مطالعہ کیا۔ کافی ہاؤس دیکھے' میوزیم وزٹ کئے' لائبریریاں کھنگالیں اور یوں محسوس کیا کہ علم کے سمندر میں جسم اور روح دونوں تر بہ تر ہیں۔
شعیب بھائی کیا بتاؤں انگریز ہم پر ویسے ہی حکومت نہیں کر گئے' بہت لائق آدمی ہیں' بہت پڑھے لکھے ہیں۔ بس اب وہاں بھی انقلاب آنے والا ہے' سماجی انقلاب! ان کی نئی نسل نئی اقدار اپنا رہی ہے۔ وہ لارڈ بننے کی بجائے انسان بننے کو ترجیح دیتے ہیں اور وہاں کے انٹلیکچوئل عظیم برطانیہ یا (GREAT BRITIAN) کے گن گانے کی بجائے انسان اور انسانیت کی بات کرتے ہیں۔ بعض نکتہ چیں ان پر سوشلسٹ ہونے کا الزام دیتے ہیں جو سراسر غلط ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آدمی میں انسانیت آجائے خواہ سوشلزم ہی سے کیوں نہ آئے۔ اچھی بات ہے' کیوں شعیب بھائی آپ کا کیاخیال ہے؟"

"ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو ضمیر! میں تم سے پورا پورا اتفاق کرتا ہوں البتہ اس میں اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ انسانیت لانے کے لیے سوشلزم کے خار زار میں داخل ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم مسلمان ہیں' اسلام سے بہتر انسانیت کا درس دینے والا کوئی دین نہیں ہے۔"

"میں آپ سے ایگری (AGREE) کرتا ہوں بھائی جان! لیکن اسلام....... اصلی اور سچا....... اسلام لائیے تو!"

وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ملک صاحب اور پرویز زمینوں سے واپس آگئے۔ ملک صاحب نے دور سے ضمیر کو شعیب کے پاس بیٹھے دیکھا تو پرویز سے کہا "مجھے تو وہ ضمیر نظر آرہا ہے۔ یہ بھگوڑا کب آیا؟"

"ڈیڈی' آج ہی آیا ہوگا' ہماری غیر حاضری میں' لیکن خدا کے واسطے اسے کچھ کہئے

گا نہیں‘ پتہ نہیں کہاں سے آیا ہے‘ کیا خیالات لے کر آیا ہے۔ غصے یا ناراضی میں کچھ اور نہ کر بیٹھے۔ آخر حویلی سے اس کا تعلق تو ہے نا! اس کی ہر حرکت سے

حویلی کی ساکھ پر اثر پڑ سکتا ہے۔"

ملک صاحب کا پہلا رد عمل تو غصے کا تھا کیونکہ وہ بغاوت اور خود سری کو ہرگز پسند نہیں کرتے تھے لیکن پرویز کی بات خصوصاً اس کے آخری حصے کو سن کر انہوں نے غصہ پی لیا۔ ان کے غصے سے پھنکتے ہوئے نتھنے اپنی جگہ پر آ گئے اور انہوں نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے ضمیر کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور کہا Young man? How are You (نوجوان‘ کیسے ہو تم؟) ضمیر نے اٹھ کر سلام کیا اور نہایت ادب سے اپنی خیریت کی خبر دی۔ دو چار جملوں کے تبادلے کے بعد ملک صاحب اندر چلے گئے اور ضمیر اور پرویز دو بھائیوں کی طرح ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر ملے۔

بعد میں ذکیہ بیگم‘ عذرا بیگم اور گھر کے دوسرے افراد نے مل کر ملک صاحب کو ٹھنڈا کیا۔ وہ اس بات پر آ گئے کہ کسی اور چیز کے لیے نہیں تم کم از کم اپنی شان اور حویلی کی عظمت کی خاطر ہی سارے واقعے سے در گذر فرمائیں اور ضمیر کو معاف کر دیں۔ ملک صاحب باہر سے جتنے بڑے لگتے تھے‘ اندر سے اتنے ہی چھوٹے تھے خاص طور پر کسی کو معاف کرنے کی صلاحیت ان میں بہت کم تھی۔ انہوں نے دل سے ضمیر کو مکمل طور پر معاف تو نہ کیا البتہ اپنی اور حویلی کی شان کو برقرار رکھنے کے لیے یہ تاثر دینا شروع کر دیا کہ سب ٹھیک ہے‘ ضمیر بھی میرا اتنا ہی بیٹا ہے جتنا کہ شعیب‘ قدیر یا پرویز! وہ حسب سابق اپنے چار بیٹوں پر فخر کرنے لگے اگر موجودہ حریف یا مستقبل کا متوقع حریف سامنے آتا تو کہتے لوگوں کے دو بازو ہوتے ہیں میرے چار بازو ہیں.......

چار بازو!

اب ضمیر کا زیادہ وقت حویلی کے اندر اپنے مخصوص بنگلے میں گذرتا تھا جہاں دوسرے بھائیوں کے بنگلوں کی طرح ساری آسائشیں موجود تھیں‘ اس نے شادی کرنے سے ایک

بار نہیں کئی بار انکار کر دیا تھا اور ملک صاحب اس کے اندر سرکشی کے جراثیم دیکھ کر اس پر زبردستی کرنے سے گریز کرتے تھے' انہیں ڈر تھا کہ زور ڈالنے سے اکڑی ہوئی لکڑی کہیں ٹوٹ گئی تو اس کے چٹخنے کی آواز حویلی کی چار دیواری تک محدود نہیں رہے گی بلکہ اس کی چٹاخ سے ان کے دبدبے کی پتلی قنات پھٹ جائیگی اور گاؤں والے اس میں سے جھانکنے لگیں گے' سو وہ اس موضوع پر خاموش رہے۔

ضمیر کی توجہ کا مرکز اس کی کتابیں تھیں جن کا وہ صندوق بھر کر ولایت سے لایا تھا۔ اب کمرے کا یہ حال تھا کہ ایک خوبصورت چوڑی مسہری کے سرہانے سے لے کر پائنتی تک کتابیں ہی کتابیں بکھری رہتیں۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر سگریٹوں کے ٹکڑوں سے لبریز ایش ٹرے پڑی رہتی یا بہت سے متروک یا زیر استعمال سموکنگ پائپ بکھرے رہتے۔ ساتھ ہی ولائتی تمباکو کے دو ڈبے رکھے تھے' ایک خالی اور دوسرا بھرا ہوا' ضمیر نے خالی ڈبے کا ڈھکنا اتار کر اس میں قلمیں' پنسلیں اور پین ڈال رکھے تھے اگرچہ اس کے کمرے میں ایک خوبصورت سا صوفہ سیٹ بھی رکھا تھا لیکن اس میں شاذو نادر ہی بیٹھتا تھا۔ اس کی پسندیدہ جگہ مسہری تھی جس پر دو گاؤ تکیے اور دو عام تکیے رکھے تھے جنہیں وہ حسب ضرورت ٹیک لگانے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ اس کا معروف پوزیہ ہوتا تھا کہ ٹیبل لیمپ جل رہا ہے' خود مسہری پر دراز ہے' پیچھے تکیوں کی ٹیک لگی ہے' منہ میں پائپ ہے' ایک کتاب ہاتھ میں ہے اور بہت سی کتابیں مسہری پر بکھری ہیں۔ کبھی کبھی وہ کتاب بند کئے بغیر اسے الٹا مسہری پر لٹا دیتا' پائپ بھر کر اسے آگ دکھاتا' خوبصورت سنہری فریم والی عینک اتار کر اس پر اپنے منہ سے بھاپ پھینکتا اور فلالین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے سے اس کے شیشے صاف کرنے لگتا اور پھر عینک لگا کر مطالعے میں مگن ہو جاتا۔ بس فلالین کے ٹکڑے سے عینک کے شیشے صاف کرنا اور کتابوں کے ذریعے دل کا شیشہ شفاف بنانا ہی اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔

ایک دفعہ اچانک ملک صاحب اس کے کمرے میں آدھمکے۔ انہوں نے کمرے کی حالت

دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی' کمرہ صاف رکھنے کی ہدایت کی اور کھڑے کھڑے اس کی بکھری ہوئی کتابوں کو باری باری دیکھنے لگے۔

The Wisdom of Confucious by Un Yautag.
European Philosophers from Descartes to Nietzche by Monrose C.Bearsley.
The Political Philosophy of Plato and Hegel by Foster.
Creative Imagination in the Sufism of Ibn Arabi by Gobbin.
Logic and Knowledge by Bertrand Russell.
Freedom and Reason by Hare.
The History of Western Philosophy by Russell.

کتابیں پھینک کر بد دلی سے پوچھا۔ "ضمیر! یہ کیا کباڑ اٹھا لائے ہو ولایت سے! تمہارے پاس کوئی کام کی کتاب نہیں۔"

"مثلاً"

"مثلاً چھچھوندی مارنے کی کتاب یا سنڈی تلف کرنے کے طریقوں کی کتاب یا فی ایکڑ پیداوار بڑھانے کی کتاب؟"

ضمیر نے اپنی مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا "نہیں' کوئی ایسی کتاب تو نہیں۔"

انہوں نے پھر کہا "اچھا' کوئی صنعتی پیداوار بڑھانے کے متعلق یا چاول چھڑنے کے متعلق؟"

جب اس نے پھر معذرت سے سر نفی میں ہلایا تو ملک صاحب نے تلخی سے کہا "تو پھر ولایت سے کیا کباڑ خانہ اٹھا لائے ہو...... یہ کہہ کر وہ غصے میں بھرے ہوئے باہر نکل گئے۔

ملک صاحب کو ضمیر سے دوسری شکایت یہ تھی کہ وہ حویلی کی روایت کو نظر انداز کرکے گاؤں کے پرائمری سکول میں چلا جاتا جہاں وہ کبھی ہیڈ ماسٹر کے پاس جا بیٹھتا' کبھی استادوں سے گپ شپ لگاتا اور کبھی دوسری یا تیسری جماعت میں پڑھانے کے لیے کھڑا ہوا جاتا۔ استادوں سمیت گاؤں کے لوگ ویسے ہی حویلی سے متعلق ہر شے سے نفرت

کرتے تھے اور ضمیر کو بھی مغرور، غصیل ملک صاحب کی اولاد سمجھ کر ناپسند کرتے تھے اور سکول سے چلے جانے کے بعد کہتے تھے "اونہہ، آیا بڑا سماجی کارکن! بھلا ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں رہنے والا اور کاروں میں پھرنے والا غریبوں کا ہمدرد کیسے ہو سکتا ہے؟"

ضمیر طبعاً سوشل نہیں تھا۔ وہ باہر کی نسبت اپنے اندر زیادہ جھانکتا تھا۔ وہ وسیع حویلی کے تنگ ماحول سے اکتاتا تو باہر کھیتوں کا رخ کر جاتا۔ اکیلے واک کرتا، اکیلے پائپ پیتا، اکیلے اپنی سوچوں میں گم رہتا۔ وہ زیادہ گھبراتا تو بابا چپ شاہ کی خانقاہ یا بابا بہشتی کے ڈیرے کی طرف نکل جاتا اور وہاں خاصا وقت گذارتا۔ اسے مردہ پیر کی بجائے زندہ بابا بہشتی کی صحبت میں زیادہ سکون ملتا۔ وہ اس کی ٹیڑھی اور ٹوٹی ہوئی چارپائی پر خاموش بیٹھ کر اونچے چبوترے سے دریا کے پاٹ کا نظارہ کرتا رہتا جو کہیں سے چوڑا اور کہیں سے تنگ تھا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے وہ سوچتا رہتا کہ جب دریا کے پیٹ میں برسات کا پانی بھرتا ہوگا تو کتنا پھول جاتا ہوگا۔ پھر وہ اپنے خیالات سے نکل کر بابا بہشتی سے باتیں کرنے لگتا تھا، کم سناتا، زیادہ سنتا کیونکہ بابا کی باتوں میں بڑی تاثیر تھی۔ اس کی باتیں سنتے سنتے ضمیر نے دریا کے کھلے پاٹ کی طرف نظر ڈالی اور کہا۔

"بابا! کبھی دریا نے چھل نہیں مارا؟"

"بہت مرتبہ بیٹا، بہت مرتبہ وہ دریا ہی کیا جو چھل نہ مارے۔"

"تو کبھی تمہاری جھونپڑی کو بھی نقصان پہنچا؟"

"نہیں بیٹا کبھی نہیں۔"

کیوں؟"

"یہ تو اللہ ہی جانے ہے۔"

"پھر بھی"

"پتہ نہیں، شاید وہ اسے کمزور سمجھ کر چھوڑ دیتا ہے جب اٹھتا ہے تو حویلی کی طرف ہی دیکھتا ہے لیکن ادھر بھی اس نے آج تک نقصان نہیں پہنچایا بلکہ ملک صاحب کی

زمینوں میں ملہ پھینک کر چلا جاتا' سنا ہے "ملہ" پڑنے سے فصل زیادہ ہوتی ہے۔"
"ہوتی ہو گی' بابا! تم یہ بتاؤ کبھی حویلی یا گاؤں کی طرف گئے ہو!"
"بہت کم پتر' بہت کم۔ میرا کیا کام ہے وہاں۔ شاید ساری زندگی میں تین چار دفعہ گیا ہوں گا' ایک دفعہ طغیانی کا پانی گاؤں پر چڑھ آیا تھا' دوسری دفعہ اس وقت گیا تھا جب شدید زلزلہ آیا تھا اور دیواروں میں دراڑیں پڑ گئی تھیں' اور تیسری مرتبہ جب وہاں قحط پڑا تھا۔"
"یہ کب کی بات ہے۔ مجھے تو نہ زلزلے کا پتہ ہے نہ قحط کا آپ بتائیے نا' ان کے متعلق۔"
"شاید تم ان دنوں شہر میں پڑھتے تھے۔ بہرحال ہوا یوں کہ ایک دفعہ ایک ہی سال میں شانتی نگر سے چھ اغوا ہوئے' بارہ لاشیں آئیں' مخالف فریقوں نے سر عام عورتوں کو ننگا کر دیا' بہو بہنوں کی عزت خاک میں ملائی......"
"کس نے کس کے ساتھ زیادتی کی۔"
"اسے چھوڑو بیٹا بات زیادتی کرنے والے کی نہیں' زیادتی ہونے کی ہے زیادتی ہوئی' سب کی آنکھوں کے سامنے ہوئی' اسے روکنے اور اس کی مذمت کرنے کے لیے کوئی نہ اٹھا۔ قدرت نے اس امر کا نوٹس لیا۔ بڑی سختی سے! حویلی سمیت سارا گاؤں زلزلے سے کانپ اٹھا' ڈھور ڈنگر رسے تڑوا کر بھاگ اٹھے۔ پکھیرو اپنے بسیروں سے چیخ چیخ کر اڑ گئے' لوگ "استغفار' استغفار" کہتے گھروں سے باہر نکل آئے۔ ایک جھٹکا' پھر دوسرا جھٹکا' پھر تیسرا جھٹکا! یوں لگ رہا تھا کہ قیامت آگئی ہے لیکن جب زمین سنبھلی' لوگوں کے ہوش ٹھکانے لگے تو یہ دیکھ کر سکھ کا سانس لیا کہ صرف چند دیواروں میں دراڑیں آئی ہیں۔ قدرت نے جھنجوڑا خوب ہے لیکن نقصان زیادہ نہیں ہوا۔ شاید قدرت صرف خبردار کرنا چاہتی تھی۔ سزا کی گھڑی ابھی دور تھی۔ ملک صاحب نے اسی روز ان دراڑوں پر سیمنٹ کا لیپ کروایا تھا' البتہ گاؤں والوں کو اپنی دیواروں پر دوبارہ گارا لگانے میں خاصے دن لگ گئے تھے۔ لیکن نہ حویلی کو زیادہ نقصان پہنچا نہ گاؤں والوں

کو۔"

"اور قحط؟"

"ہاں بیٹا' قحط والا واقعہ بھی آج تک معمہ ہی چلا آتا ہے۔ پتہ نہیں قحط کیوں پڑا!"

"ہوا کیا تھا؟"

"ہوا یہ تھا کہ ملک صاحب نے حسب معمول ایک غیر ملکی ماہر زراعت بلوایا اور اس سے مشورہ لیا کہ فی ایکڑ پیداوار کیسے بڑھائی جا سکتی ہے۔ اس نے پیداوار بڑھانے کے گر بتانے کے علاوہ اس بات کی نشاندہی بھی کی کہ کھیت سے گودام تک پہنچتے پہنچتے ایک تہائی غلہ ضائع ہو جاتا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"اس غیر ملکی ماہر کے خیال کے مطابق چڑیاں' طوطے' کوے' کبوتر' فاختائیں اور دوسرے پرندے یا تو خوشوں میں سے دانے چگ جاتے ہیں یا کٹی ہوئی فصل کے ڈھیر سے اس کا اچھا خاصا حصہ ہڑپ کر جاتے ہیں۔"

"پھر؟" "پھر ملک صاحب نے غیر ملکی ماہر کے جانے کے بعد سارے پرندے تباہ کر دینے کا فیصلہ کیا' تمام نوکروں کو ائیر گنوں' چھروں والی بندوقوں' کلہاڑیوں' ڈنڈوں اور غلیلوں سے مسلح کرکے پرندے تلف کرنے پر لگا دیا۔ پھر شہر سے زہریلی دوائیاں منگوا کر ہر جگہ چھڑ کوائیں یہاں تک کہ رات کو پرندے جن درختوں پر پناہ لیتے تھے' وہ بھی کٹوا دیئے۔ پرندے غائب ہو گئے۔"

"پھر۔ پھر ایسا قحط پڑا' ایسا قحط پڑا کہ انگریزوں کے زمانے میں بنگال میں بھی نہ پڑا ہو گا' ہر کیاری سوکھ گئی' ہر فصل تباہ ہوئی' کھیتوں سے ہریالی اور چہروں سے خوشحالی غائب ہو گئی ملک صاحب تو پھر حویلی والوں کے لیے شہر سے غلہ لے آئے لیکن گاؤں والوں کی حالت بڑی خراب تھی۔ میں گاؤں میں گیا' اللہ کے کئی نیک بندے دور و نزدیک سے مدد کو پہنچے' شہر سے امدادی پارٹیاں آئیں' ہم سب نے مل کر اور گڑ گڑا کر معافیاں مانگیں' گناہوں سے توبہ کی' پرندوں سے معافی مانگی' ماتھے رگڑے' سجدے کئے تب کہیں

جا کر بارش ہوئی' درختوں کے ٹنڈوں میں شگوفے پھوٹنے لگے' کھیتوں میں ہریالی نظر آنے لگی' پرندے چہچہانے لگے اور لوگوں کی جان میں جان آئی۔ استغفار! استغفار!"

ضمیر دیر تک بابا بہشتی کی باتیں سنتا رہا شام کے دھند لکے میں کندھے پر چادر ڈالے' پیدال ہی حویلی کی طرف چل دیا جہاں وی سی آر' ٹیلی وژن' ڈیپ فریزر' کاروں' فیکٹریوں اور فی ایکڑ پیداوار بڑھانے کی باتیں ہو رہی تھیں۔

ملک جابر علی خان اور ان کی دوسری بیوی عذرا نے شادی کے وقت باہمی رضا مندی سے یہ طے کیا تھا کہ وہ پانچ سال تک کوئی بچہ پیدا نہیں کریں گے کیونکہ عذرا کوئی اپنی "فگر" (FIGURE) درست رکھنے کی فکر تھی اور ملک صاحب کو اس فگر' (FIGURE) سے زیادہ سے زیادہ عرصے تک لطف اندوز ہونے کا شوق تھا۔ بچے تو ذکیہ سے بھی تھے بلکہ اب تو بچوں کے بچے بھی ہوگئے تھے' وہ تو ملک صاحب کو ایک تقریب میں عذرا پسند آگئی تھی اور انہوں نے اپنے بڑوں کی روایت نبھانے کے لئے دوسری شادی رچالی تھی' ورنہ اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن ملک صاحب کے ہاں تو ہر شے ضرورت سے زیادہ تھی اگر ایک بیوی کا اضافہ ہو گیا تو کون سی انہونی بات ہو گئی۔

عذرا دیہاتی اور شہری حسن کا بڑا اچھا امتزاج تھی یعنی وہ لینڈ لارڈ گھرانے میں پیدا ہوئی' دودھ اور مکھن کھا کر پلی بڑھی لیکن جب کالج میں پہنچی تو اس قدرتی حسن میں شہری رنگ و بو سے ایک نیا نکھار آگیا...... گورا گندمی رنگ' تیکھے نقش' چوڑی پیشانی' ستواں ناک' کالی سیاہ نمایاں آنکھیں' مناسب حد تک بھرے بھرے گال اور ٹھوڑی کا وہی سائز جسے شاعر آم کی گٹھلی سے تشبیہ دیتے ہیں۔ کالج کی تعلیم کے بعد بھی دنیابھر کی سیر کرتی رہی اور شاید مناسب خاوند کی تلاش بھی بظاہر یوں لگتا تھا کہ وہ ان خواتین میں سے ہے جو سیکس اور شاپنگ کے زور پر زندگی گذارتی ہیں لیکن ملک صاحب سے عقد کے بعد وہ ایسی پابند ہو گئی کہ اسے ملک صاحب کے جسم' دولت اور شہرت سے کھیلنے

کا تو خوب موقع ملا لیکن دوسری حرکتوں پر پابندی لگ گئی۔
شادی کے دو ہی سال بعد حویلی کی عورتوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ عذرا نا عورت ہے' وہ پھنڈر ہے بانجھ ہے' وہ کسی پر خوامخواہ سوکن بن کر آئی ہے' اللہ کبھی اس کی گود ہری نہیں کرے گا وغیرہ۔ جب یہ باتیں عذرا کے کان تک پہنچیں تو اسے سخت دکھ ہوا' اسے شک گذرا کہ یہ افواہ ضرور ذکیہ کی پھیلائی ہوئی ہو گی۔ جو اس کی تین بہوؤں میں سے ہوتی ہوئی اب خادماؤں او نوکرانیوں تک پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ اس نے ایک تنہائی میں ملک صاحب کو اس تکلیف دہ بہتان سے آگاہ کیا اور ذکیہ یا کسی اور کی شکایت کرنے کی بجائے بچے پیدا نہ کرنے کے باہمی سمجھوتے پر نظر ثانی کرنے کی درخواست کی جسے ملک صاحب بخوشی قبول کر لیا۔
کچھ عرصے بعد عذرا بیگم امید سے ہو گئی۔
ابتدائی مہینوں میں شہر کی لیڈی ڈاکٹر پہلی تاریخ کو حویلی میں آتی' عذرا کا معائنہ کرتی' خوراک میں جوس' مچھلی' چکن اور دوسری مقوی اشیاء تجویز کرکے اور احتیاط برتنے کا مشورہ دے کر واپس چلی جاتی۔ کریم کلر کی ٹیوٹا کار جو صبح اسے شہر سے حویلی میں لاتی' سہ پہر کو واپس شہر چھوڑ آتی۔
سفید کوٹ میں لیڈی ڈاکٹر باقاعدگی سے آتے جاتے دیکھ کر ملازموں خصوصاً حویلی کے گیٹ پر متعین خدمت گاروں میں سرگوشیاں ہونے لگیں کہ چھوٹے ملک صاحب کی آمد آمد ہے جس کی پیدائش پر انہیں ایک عرصے کے بعد پھر انعام و کرام سے نوازا جائے گا۔
چند ماہ کے بعد لیڈی ڈاکٹر نے آنا چھوڑ دیا کیونکہ اب ذرا تفصیلی معائنہ کی ضرورت تھی' کئی ٹیسٹ ضروری ہو گئے تھے' ایکسرے بھی درکار تھے جس کے لئے اب عذرا کو وقتاً فوقتاً شہر جانا پڑتا تھا وہ کبھی چار گھوڑوں والی بگھی میں اور کبھی اچھے شاک آبزاربرز (SHOCK ABSORBERS) والی بیوک میں شہر چلی جاتیں۔ عموماً ان کے ہمراہ ان کی ذاتی خادمہ نسرین ہوتی اور کبھی کبھی ملک صاحب بھی شہر میں کسی کا بہانہ کرکے چھوٹی

بیگم کے ساتھ چلے جاتے۔

چھوٹے ملک صاحب کی آمد میں ابھی ایک مہینہ باقی تھا۔ عذرا کی حالت تسلی بخش تھی' بانجھ پن کی افواہیں بھی دم توڑ چکی تھیں اور حالات ہر لحاظ سے پر سکون تھے کہ ایک دن ملک جابر علی کی گرجدار اور غصیلی آواز میں لپٹی ہوئی غلیظ گالیوں نے تہلکہ مچا دیا۔

دراصل ہوا یہ کہ ملک صاحب حسب معمول خاکی برجس' چیک کوٹ اور گاف کیپ پہن کر شکار کے لیے نکلنے والے تھے کہ کسی ملازم نے اطلاع دی کہ چھوٹی بیگم جو آدھ گھنٹہ پہلے کار پر نسرین کے ساتھ شہر روانہ ہوئی تھیں' راستے میں رکی ہوئی ہیں کیونکہ کار خراب ہو گئی ہے ملک صاحب کو سخت غصہ آیا'انہوں نے گھوڑا واپس اصطبل میں بھجوایا' دوسری کار بیگم کو لانے کے لئے روانہ کی اور خطا کار ڈرائیور کا انتظار کرنے لگے۔

جونہی طالب ڈرائیور کی شکل نظر آئی' وہ اس پر برس پڑے

"او' حرام زادے' نالائق' نمک حرام......" "خصورا! میرا کوئی قصور نہیں' کچی سڑک پر کار بوریٹر میں کوئی کنکر پھنس گیا تھا۔"

"کنکر کے بچے! کیا پہلی دفعہ کچی سڑک پر گئے تھے' کیا پہلی دفعہ کار چلائی تھی؟ کون سی کار لے گئے تھے؟"

"مرسڈیز ایل ای ڈی ۱۱۳۔"

"حرام زادے! کچھ عقل سے کام لیا ہوتا! تم مرسڈیز چلانے کے بہت شوقین ہو' پتہ ہے وہ کتنی پرانی ہے؟ وہ گاڑی تمہاری ماں کی ہم عمر ہو گی......"

"جی ابھی پرسوں گیراج انچارج نے ٹھیک کروائی تھی۔"

"بکواس بند کرو! یہ کیوں نہیں کہتے کہ حرام زدگی تم نے کی ہے' تمہیں نئی امپالا کی نسبت پرانی مرسڈیز زیادہ پسند ہے' اور تم نے بیگم صاحبہ کا خیال کئے بغیر اپنی مرضی کرنے کی کوشش کی۔ اگر راستے میں انہیں کچھ ہو جاتا تو...... جاؤ دفع ہو جاؤ میری

نظروں سے ڈسمس! جاؤ جا کر منشی سے اپنا حساب کر والو...... الو کہیں کا!"

ڈرائیور طالب نے ایک دو دفعہ معافی مانگنے کی کوشش کی لیکن ملک صاحب کا غصہ عروج پر تھا' انہوں نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کر کے چلتا کیا۔

خراب ہونے والی پرانی مرسڈیز بیچ ڈالی۔

کنکروں والی سڑک تارکول والی پکی سڑک میں بدل دی۔

چھوٹی بیگم کے لئے نئی امپالا وقف کر دی۔

گاڑی بریک ڈاؤن ہونے والے واقعے کے چند ہی روز بعد ملک صاحب نے لندن کے لیے تین سیٹیں بک کروائیں...... ایک اپنے لئے' ایک عذرا کے لئے' ایک نوکرانی نسرین کے لئے وہاں البرٹ وکٹر ہسپتال ٹیلی گرام دیا اور عذرا کے پہلے بچے کی ڈیلوری کے لئے لندن روانہ ہو گئے۔ انہیں ذکیہ کے پیٹ سے پیدا ہونے والی اولاد کا حشر یاد تھا جس نے ذکیہ کی زندگی بھی خطرے میں ڈال دی تھی اور وہ بڑے طویل علاج معالجے کے بعد تندرست ہوئی تھی۔ وہ عذرا کے بارے میں کوئی رسک لینے کو تیار نہ تھے۔

ویسے بھی انہیں ملکی ہسپتالوں پر زیادہ اعتماد نہ تھا...... گندے کمرے' لاپروا ڈاکٹر' پرانا سامان' پرانی دوائیاں' غیر معیاری لیبارٹری ٹیسٹ' گھٹیا غذا وغیرہ! اس کے برعکس لندن کا ہسپتال بڑا صاف ستھرا تھا' دھلے دھلائے یونیفارم میں دھلی دھلائی نرسیں' کوالیفائڈ ڈاکٹر اور تجربہ کار پیرا میڈیکل سٹاف' ہسپتال کی عمارت' سامان' دوائیاں غرضیکہ ہر چیز معیاری! وہاں ایئر کنڈیشنڈ لیبر روم میں نہایت فرض شناس اور تجربہ کار ڈاکٹروں کی نگرانی میں عذرا نے اپنے پہلے بچے کو جنم دیا جس کا نام ذوالفقار رکھا گیا لیکن سبھی اسے زلفی کہنے لگے۔

زلفی جس ماحول میں پیدا ہوا' اس کے مطابق اس کی نگہداشت کی گئی۔ اس کا وزن کیا گیا جراثیم سے پاک کپڑے پہنائے گئے' تصدیق شدہ ولایتی ڈبوں کا دودھ پلایا گیا' فیڈ کے لئے ٹائم ٹیبل بنایا گیا سسٹر نے ایک ہفتے تک اسے اپنی نگرانی میں رکھا' پھر

ملک صاحب نے دو سال کے کنٹریکٹ پر ایک انگریز گورنس کو بچہ سونپا' خود عذرا کو سیر کرائی' شاپنگ کروائی' ہنی مون کئی دنوں کی یاد تازہ کروائی اور لندن کی سب سے فیشن

ایبل دکان JEWELS AND JEWELS سے ڈائمنڈ کا سب سے قیمتی سیٹ خرید کر اسے تحفے کے طور پر پیش کیا۔

زلفی کی پیدائش کے ایک ماہ بعد ملک صاحب عذرا' نسرین اور گورنس سمیت شانتی نگر پہنچ گئے۔

کلو کی بیٹی یعنی بوٹا خان کی بیوی سکینہ شادی کے پہلے سال ہی ماں بننے والی ہو گئی۔ سات آٹھ مہینوں میں اس کا تر و تازہ چہرہ مرجھا گیا۔ گالوں پر چھائیاں پڑ گئیں اور طبیعت مضمحل رہنے لگی۔ بڑی بوڑھیوں نے اسے بتایا تھا کہ بچے کی پیدائش کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن وہ آنیوالے وقت کے تصور ہی سے کانپ اٹھتی تھی۔ اس کی ماں پھلاں نے خود اسے کئی مرتبہ تسلی دی کہ وہ فکر نہ کرے۔ سب عورتوں پر یہ وقت آتا ہے' اور وہ خود گھر میں اس کے پاس موجود ہے۔ لیکن سکینہ کسی انجانے خوف سے بہت پریشان رہتی تھی۔

ایک دن کلو اور بوٹا خان کھیت میں بوائی کرنے گئے ہوئے تھے۔ پھلاں سکینہ کو ٹھیک ٹھاک دیکھ کر انہیں کھیت میں کھانا پہنچانے چلی گئی۔ بوٹا خان نے ہل تھاما اور کلو پھلاں کے درخت کے نیچے بیٹھ کر کھانے کی پوٹلی کھولنے لگا۔ اس میں باجرے کی دو بڑی روٹیاں ان پر پودینے کی تھوڑی سی چٹنی رکھی تھی' ساتھ لسی کی ڈولی تھی اور مٹی کا ایک پیالہ' کلو نے چپکے سے سکینہ کا حال پوچھا تو پھلاں نے بتایا وہ ٹھیک ٹھاک ہے' کروشیا لے کر کچھ کاڑھ رہی ہے فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس کے بعد اس نے بوٹا خان کو آواز دی کہ وہ بیلوں کی پنجالی ذرا ڈھیلی کرکے روٹی کھا لے۔ بوٹا خان دونوں ہاتھوں سے اپنے منہ اور کپڑوں سے مٹی جھاڑتا ہوا درخت کے نیچے آ بیٹھا۔ پھلاں نے مشترکہ پیالے میں لسی ڈال کر ایک ایک روٹی ان کے سامنے رکھ دی۔ انہوں نے لقمہ

توڑ کر پودینے کی ہری ہری چٹنی سے چھوا' منہ میں ڈالا اور پھر باری باری پیالے سے گھونٹ لے کر خشک روٹی کو گلے سے نیچے اتارنے لگے۔ لسی تھوڑی تھی کیونکہ ان کی اپنی بھینس سوکھ چکی تھی اور پھلاں بابا میراں بخش کے گھر سے ایک ڈولی لسی مانگ کر لائی تھی۔ کلو نے معمول کے گھونٹ سے ذرا بڑا گھونٹ بھرا اور منہ میں پھنسے ہوئے باجرے کے ٹکڑے کو اس میں بھگونا شروع کیا تو اس کے دونوں طرف کے گال پھول گئے۔ پتہ نہیں اصل میں پھولے یا نہیں' کم از کم اس کی ڈاڑھی باہر نکل آئی۔ پھلاں نے اس کے ننگے گھٹنے پر دھپا مار کر کہا "کلو' کوئی شرم کر' پتر بوٹے کا بھی خیال رکھ' اس کی ابھی آدھی روٹی پڑی ہے۔ تو نے اتنے اتنے بڑے گھونٹ بھرنے شروع کر دیئے تو وہ حلق سے باجرے کے سوکھے ٹکڑوں کو کیسے اتارے گا...... تو نے کھاپی کر اب کوئی بڑا ہونا ہے!" کلو کے جواب دینے سے پہلے بوٹا خان بولا۔

"نہیں ماسی انہیں پینے دو' میری خیر ہے۔"

"اللہ تیری خیر ہی رکھے' پتر! لیکن چیز تھوڑی ہو تو ایک دوسرے کا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔"

"نہیں کوئی بات نہیں ماسی۔"

یہ کہہ کر بوٹا خان نے پھر ہل چلانا شروع کر دیا اور کلو حقے کے دو سوٹے لگانے بیٹھ گیا۔ بوٹا خان نے زور سے ہل کی ہتھی پکڑ رکھی تھی اور بیلوں کی جوڑی آہستہ آہستہ بڑی مشکل سے سخت زمین کا سینہ چیر کر آگے بڑھ رہی تھی۔ جہاں سے ہل گذرتا وہاں خشک مٹی کے اچھے خاصے ڈھیلے اٹھتے جاتے' دو دو چار چار سیر کے ٹیڑھے میڑھے ڈھیلے! کلو نے پھلاں کو بے تکلفی سے کہا۔

"اگر سکینہ کی تجھے تسلی ہے تو یہاں بیکار بیٹھنے کی بجائے یہ ڈھیلے ہی توڑتی جا' کونسی گھس جائے گی تو!"

"میں پہلے کونسی کرسی پر بیٹھی رہی ہوں ساری عمر' ڈھیلے کوٹتے اور تیرا حقہ بھرتے ہی تو عمر گذری ہے تیرے ساتھ! ادھر دے کدال' میں کوٹ دیتی ہوں' اس میں کونسی

نئی بات ہے!"

"وہ یہ کہہ کر اٹھی اور ہل چلے کھیت میں کدال کی پشت سے ڈھیلے توڑنے لگی۔ بوٹا خان نے ایک دو دفعہ کہا بھی کہ ماسی تو رہنے دے میں کوٹ لونگا لیکن وہ بولی "تیرا چاچا مجھے فارغ بیٹھا نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے کام کرنے دے' کسی نہ کسی کو تو کرنا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ مٹی کے بڑے بڑے خشک ڈھیلے توڑتی رہی' بابا کلو حقہ پیتا رہا اور بوٹا خان ہل چلاتا رہا۔ ایک کونے پر زمین ذرا سخت تھی اور ہل کا پھل اس کے اوپر سرک کر گذر جاتا تھا۔ بوٹا خان نے بیلوں کی جوڑی کو گھما کر ہل کی نوک سخت زمین پر رکھی اور دونوں ہاتھوں سے ہتھی دبادی ہل تو اندر دھنس گیا لیکن بیلوں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ اسے آگے کھینچ سکتے۔ بوٹا خان نے ایک ہاتھ خالی کر کے کالے بیل کی پیٹھ پر ڈنڈا برسایا تو اس نے ہل کو آگے کھینچنے کی بجائے وہیں گھٹنے ٹیک دیئے۔ بوٹا خان نے غصے میں آکر اس پر دوسرا ڈنڈا مارا تو بابا کلو چیخا "پتر نہ مار اسے' ننگے تن یہ اتنا ہی بوجھ کھینچ سکتا ہے جتنی اس میں ہمت ہے۔ تو آ' ادھر آکر حقے کی واری لگا لے۔ اسے بھی ذرا ستا لینے دے' تھوڑی دیر بعد اٹھ کھڑا ہو گا...... خود بخود۔"

بوٹا خان نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بیلوں کو ان کے حال پر چھوڑا اور خود کلو کے پاس بیٹھ کر حقہ پینے لگا۔ پھلاں حسب معمول الٹی کدال کو دونوں ہاتھوں سے الٹا کر موٹے موٹے ڈھیلوں پر مارتی رہی' کچھ ٹوٹتے رہے اور کچھ بن ٹوٹے پہلو بدلتے رہے۔

ادھر گھر میں پھلاں کے جاتے ہی سکینہ کو دردزہ شروع ہو گیا۔ وہ کروشیا چھوڑ کر منج کی خالی چارپائی پر جا لیٹی۔ وہ چپ چاپ اس امید پر لیٹی رہی کہ تھوڑی دیر بعد درد خود بخود ختم ہو جائے گا کیونکہ اس کے حساب سے ابھی پندرہ دن باقی تھے۔ چاند کی ۲۵ یا ۲۶ تاریخ کو دن پورے ہوتے تھے' اور آج تو صرف نو یا دس تاریخ تھی۔ اس نے لیٹے لیٹے انگلیوں پر دوبارہ حساب کیا اور اسے اپنے قیاس پر یقین آ گیا۔ اس نے سوچا بس یہی معمولی سا درد ہے' ٹھیک ہو جائے گا لیکن درد لحہ بہ لحہ بڑھنے لگا اور بے اختیار

ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ وہ چارپائی سے اٹھی اور پڑوسیوں کی کچی دیوار کے ساتھ لگ کر "ماسی ' ماسی' ماسی نوراں" پکارتی رہی لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ شاید ماسی نوراں اور اس کے گھر والے بھی اپنے کام سے کہیں گئے ہوئے تھے کیونکہ اسوج اور کاتک کے دن ہی ایسے تھے کہ ہر کسی کی کوشش تھی کہ چند دانے بیج پھینک آئے تا کہ بارش کی صورت میں بوری دو بوری دانے ہی آجائیں...... لوگ امید کے تعاقب میں کہاں کہاں تک نہیں جاتے' یہ تو چند فرلانگ باہر کھیتوں تک جانے کا معاملہ تھا۔ ہر کاشت کار باہر تھا اور سکینہ اس کسمپرسی کے عالم میں اپنی زندگی کے پہلے اور سب سے بڑے امتحان سے دوچار ہوچکی تھی۔

مٹی کی دیوار سے ہٹ کر سکینہ پانی کے گھڑے کی طرف لپکی تا کہ اپنا حلق تر کر سکے۔ اس نے پیالہ ہاتھ میں لے کر گھڑے کو الٹا یا تو وہ پہلے اشارے ہی سے سارے کا سارا الٹ گیا۔ سارا پانی صحن میں بہہ گیا۔ اس نے دو تین مرتبہ گھڑے کو پھر زمین بوس کیا لیکن پانی نہ نکلا۔ اس نے گھڑے کے اندر جھانکا تو اسے تہہ میں پارے کی طرح چمکتا ہوا پانی دکھائی دیا' اسے نکالنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ دونوں ہاتھ سے گھڑے کو اٹھا کر پیالے پر اوندھے منہ جھکایا جائے لیکن سکینہ میں اب اتنی ہمت نہ تھی کہ ایسا کر سکے حالانکہ بھلے دنوں میں وہ کنوئیں سے اینٹوں سے بھرا ہوا ٹوکرا اور ٹھنڈے کنوئیں سے پانی کے دو دو گھڑے اٹھا کر لاتی تھی لیکن آج اس کی ہمت بالکل جواب دے رہی تھی۔ بالاخر جب اس کی پیاس برداشت سے باہر ہونے لگی تو اس نے اپنی بچی کچھی قوت کی ایک اونس جمع کی اور گھڑا اٹھا کر پیالے پر انڈیل دیا۔ چند گھونٹ پانی پیالے میں جمع ہو گیا لیکن مٹی اور جالوں سے بھرا ہوا۔ جب سے سکینہ نے کام کاج چھوڑا تھا پھلاں نے گھر کی صفائی کا خیال رکھا تھا نہ گھڑوں کی۔ سکینہ گندے پانی سے بھرا ہوا پیالہ اٹھا کر اندر چلی گئی تا کہ مٹی اور جالے (جس میں بوری کے ٹوٹے ہوئے دھاگے بھی شامل تھے) بیٹھ جائیں تو اپنا حلق تر کر سکے۔ درد بڑھتا گیا' وہ

چیختی رہی، چلاتی رہی، کبھی اپنی ماں پھلاں کو اور کبھی پڑوسن ماسی نوراں کو آواز دیتی رہی لیکن اس آڑے وقت میں اس کی مدد کو کوئی نہ پہنچا۔ اس نے سارا امتحان تنہا ہی دے ڈالا۔ موت و حیات کی کشمکش سے تنہا ہی بچ کر نکل آئی۔ اللہ تعالٰی نے اسے بیٹے کی نعمت سے نوازا۔ گندے پانی کا پیالہ وہیں زمین پر پڑا رہا۔ اور سکینہ کے خشک حلق میں سوئیاں چبھنے لگیں۔

ادھر سکینہ تکلیف سے جانبر ہوئی، ادھر پھلاں خالی ٹوکرا، لسی کی خالی ڈولی، روٹی کا میلا رومال اور کدال لے کر گھر میں داخل ہوئی۔ وہ "سکینہ، سکینہ" کہتی ہوئی اندر گئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ سکینہ پسینے میں شرابور نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑی ہے۔ اس نے اس کے ماتھے کو چھوا، اپنے گرد آلود دوپٹے سے اس کا چہرہ خشک کیا، سرہانے پڑے پیالے سے اسے پانی پلایا (نیم تاریک کونے اور گھبراہٹ میں اسے نظر ہی نہ آیا کہ پانی صاف ہے یا گندہ) پھر اپنے نواسے پر نظر ڈالی، اللہ تعالٰی کا شکر ادا کیا، اپنی بے وقت غیر حاضری پر اپنے آپ کو کوسا اور زچہ اور بچے کی زندگی اور صحت کے لئے دعا کرنے لگی۔

جب کلو اور بوٹا خان واپس گھر آئے تو پھلاں نے انہیں خوش خبری سنائی۔ دونوں نے بڑے چاؤ سے بچے کو دیکھا۔ اللہ تعالٰی کا شکر ادا کیا...... اور پھر سب نے مل کر نومولود کا نام رحم علی رکھ دیا۔

بوٹا خان نے فوراً قسم کھا کر کہا کہ وہ خود بھوکا رہ لے گا رحم علی کو ضرور تعلیم دلوائے گا...... اعلٰی سے اعلٰی تعلیم! خواہ اس کے لئے اسے کتنے ہی پاپڑ کیوں نہ بیلنا پڑیں۔

سدا کی جہالت اور غربت ہمارا مقدر تو نہیں۔

بعد میں جب یہ درد ناک داستان ملک صاحب تک پہنچی، تو انہوں نے ایک ملازم کے ہاتھ ایک ہزار روپیہ بابا کلو کو بھجوایا اور ساتھ ہی یہ تاکید کروا دی کہ اس معمولی سی رقم کا ڈھنڈورا پیٹنے کی ضرورت نہیں۔

ملک جابر علی خان کی پہلی بیوی ذکیہ اگرچہ ملک صاحب سے عمر میں کوئی چار پانچ سال چھوٹی تھی لیکن کثرت اولاد اور کثرت دولت کی وجہ سے خاصی پچک گئی تھی۔ اب بڑی بڑی بیگمات کی طرح اس کا پیٹ آگے بڑھا ہوا تھا جس پر ریشمی قمیض طبلے کی طرح تنی رہتی تھی۔ یہی حال سینے کے ابھار کا تھا البتہ پیٹ اور سینے کے درمیان ایک گھاٹی پڑتی تھی جہاں ریشمی قمیض کی سلوٹوں میں اکثر پسینہ آجاتا تھا۔ پھیلے ہوئے جسم کی طرح اس کا گورا گورا چہرہ بھی پھول کر کپا بن گیا تھا جس پر وہ اب باقاعدگی سے میک اپ کے بعد سائز میں تربوز اور رنگ و روغن کے لحاظ سے سیب لگتا تھا ٹھوڑی کے نیچے لٹکے ہوئے گوشت کی ایک اور ٹھوڑی بن گئی تھی اور گلے میں سفید موتیوں کے ہار کے ساتھ جھریوں کے چار پانچ ہار اور پیدا ہو چکے تھے۔ کھچڑی بال بیمار مرغی کی دم کی طرح لگتے تھے لیکن وہ انہیں خال خال ہی اصلی رنگ میں رہنے دیتی۔ وہ ماڈرن بیویوں کی طرح ہیئر ڈائی کرنے کی بجائے روایتی بیگمات کی طرح مہندی لگایا کرتی تھی......

اور جب رنگے ہوئے بالوں' رنگے ہوئے چہرے اور بھاری بھر کم جسم کے ساتھ اونچی ہیل کا جوتا پہن کر پرس لٹکاتی وہ حویلی کے مرکزی حصے میں سے اترتی تو پوری حویلی میں خبر ہو جاتی کہ بڑی بیگم حویلی سے اتر رہی ہیں۔

ذکیہ کو عرصے سے بلڈ پریشر کی تکلیف تھی اور ڈاکٹر کئی بار اسے وزن کم کرنے کا مشورہ دے چکے تھے لیکن اس کے جسم کی عجب خاصیت تھی کہ جتنی پرہیزی غذا کھاتی' وزن اتنا ہی بڑھتا جاتا۔ پھر ڈاکٹر نے ورزش یا چہل قدمی کرنے کی تاکید کی تو اپنی امیرانہ کاہلی کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکی۔ ایک دو دفعہ حویلی کے مرکزی حصے کی سیڑھیوں سے لے کر حویلی کے گیٹ تک سرخ قالین بھی بچھائے گئے تاکہ بیگم صاحبہ اونچی ہیل والے پسندیدہ جوتے سمیت "واک" کر سکیں لیکن انہیں یہ چہل قدمی پسند نہ آئی۔

وہ اپنے بیڈ روم ہی میں اپنی ذاتی خادمہ کو بلوا کر اپنے جسم کو دبوا لیتی اور اس کو ورزش سمجھ کر مطمئن ہو جاتی۔

ملک صاحب کی دوسری شادی کے بعد ذکیہ کا بلڈ پریشر پہلے سے ہائی ہو گیا تھا اور اسے کبھی سینے میں' کبھی بازو میں اور کبھی گردن کے پٹھوں میں درد اٹھنے لگتا۔ نیند بھی کم آتی اور سر درد بھی رہنے لگا۔ وہ پاکستانی ڈاکٹروں کے مشوروں سے تنگ آچکی تھی اور انہیں نا لائق اور دقیانوسی سمجھتی تھی۔ وہ اکثر کہتی کہ ولایت میں لوگ چاند پر پہنچ رہے ہیں اور یہ آج بھی وزن کم کرنے اور ورزش کرنے کا مشورہ دے کر میرے بلڈ پریشر کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔

ایک رات جب ملک صاحب ذکیہ کے کمرے میں گئے تو اس نے بھلے وقتوں کی یادیں دہرانے کی بجائے اپنی بیماری کا قصہ چھیڑ دیا اور شکایت کے انداز میں کہا "میں اس خوبصورت پنجرے میں پڑی پڑی مرنا نہیں چاہتی ...."

"تو تم باہر مربعوں وغیرہ کی سیر کو نکل جایا کرو!"

"میں مربعوں کی سیر کی شوقین نہیں' جب وقت تھا میں تو ان دنوں بھی ملکانی بن کر مربعوں پر نہیں گئی......."

"مگر کیوں" "میں ایک دفعہ مویشیوں اور مزارعوں کے درمیان سے گذری تو مجھے FEVER HAY ہو گیا اور......." "تو مزارعوں کی عورتوں کی طرف نکل جایا کرو!"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں! چالیس سال ہو گئے ہیں اکٹھے رہتے ہوئے' آپ ابھی تک مجھے سمجھ نہیں پائے۔ مجھے ان عورتوں کے جسموں اور کپڑوں سے ابکائی آنے لگتی ہے۔ جب وہ مراد آبادی پیالہ بھر کر شپ شپ چائے پیتی ہیں تو مجھے الٹی آنے لگتی ہے۔ آپ مجھے کدھر کا راستہ دکھا رہے ہیں۔"

"تو تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں باہر جانا چاہتی ہوں...... ملک سے باہر' چیک اپ کے لئے!"

"کہاں؟"

"پیرس' لندن' نیویارک' کیلیفورنیا...... انہی راہوں پر جہاں ہم ۴۰ برس پہلے ہنی مون کے لئے گئے تھے۔"

"گویا تمہارے بوڑھے دل میں پھر جوانی کی امنگ جاگ اٹھی ہے"

"نہیں' یہ بات نہیں۔"

"تمہاری یہ خواہش ففٹی ففٹی پوری ہو سکتی ہے"

"وہ کیسے"

"تم پرویز کو ساتھ لے کر چلی جاؤ کیونکہ میں......"

"آپ کو جانے میں کیا اعتراض ہے؟"

"اعتراض نہیں' مجبوری ہے۔ میں نے دو تین نئے پروجیکٹ شروع کر رکھے ہیں۔ والدہ صاحبہ کا مقبرہ گھوڑوں کا نیا اصطبل ڈیزائن کرانے کے آرکیٹکٹ (ARCHITECT) بلوا رکھے ہیں۔ اس کے علاوہ اگلے مہینے دو غیر ملکی ماہرین آ رہے ہیں۔ ایک SPECIALIST FLOOD CONTROL ہے اور دوسرا FOOD PROCESSING EXPERT "ملک صاحب آپ سیدھی بات کیوں نہیں کہتے کہ آپ عذرا سے ڈرتے ہیں کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے۔"

"میں تم سے کب ڈرتا تھا جو عذرا سے ڈروں گا...... یہ سراسر تمہارا حسد ہے۔"

"میں طوفان اٹھانے والی ہر شے کو اٹھا کر دریا میں پھینک دیا کرتا ہوں' ذکیہ بیگم! اتنے سال میرے ساتھ رہنے کے باوجود بھی تم مجھے سمجھ نہیں سکیں۔ میں بہت سخی ہوں۔ بہت نرم دل ہوں۔ دولت ہی نہیں دل بھی نچھاور کرتا ہوں لیکن صرف ایک حد تک حدیہ ہے کہ ہر کوئی میری مرضی' میری خواہش اور میرے حکم کے مطابق چلے خواہ وہ میرے خاندان کا فرد ہو' میرا ملازم ہو یا شانتی نگر کا عام باشندہ! جس کسی نے ذرا روگردانی کی' میری خواہش کو نظر انداز کیا یا مجھ پر اپنی مرضی ٹھونسنے کی خواہش کی تو وہ نہ صرف گھاٹے میں رہے گا بلکہ شانتی نگر میں اس کا جینا حرام ہو جائے گا۔"

ذکیہ نے پہلی دفعہ دیکھا کہ وہی مرد جو جوانی میں اس کے جسم سے لپٹ کر اس کی ہر بات پر ہاں میں ہاں ملاتا تھا' اب ایک دوسرے جسم سے وابستہ ہونے کے بعد کسی

طرح آنکھیں پھیر چکا ہے۔ ذکیہ نے وہیں لیٹے لیٹے' دل ہی دل میں' اپنے اور عذرا کے جسم کا موازنہ کیا۔ اپنے عہد شباب کو یاد کیا' بدلے ہوئے حالات کا جائزہ لیا اور کہا۔

"ہاں' ملک صاحب آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"میں آج ہی نہیں' ہمیشہ ٹھیک کہتا ہوں۔"

"جی ہاں' ملک صاحب آپ ہمیشہ ٹھیک کہتے ہیں۔"

اگلے ہفتے ذکیہ اور پرویز یورپ اور امریکہ کے دورے پر روانہ ہوگئے۔ انہوں فلائٹ شیڈول یوں بنایا تھا کہ ہوائی جہاز کا کوئی بھی سفر چار پانچ گھنٹے سے زیادہ نہ ہو۔ وہ راستے میں دو دو دن ٹھہرتے' سیرو تفریح کرتے اور پسند کی چیزیں خریدتے جاتے۔ اصل شاپنگ انہوں نے واپسی سفر تک ملتوی رکھی تا کہ زیادہ سامان جگہ جگہ ساتھ نہ اٹھانا پڑے۔

وہ پیرس میں ایک ہفتے تک اس ہوٹل میں ٹھہرے جہاں ملک صاحب اور ذکیہ ہنی مون کے دنوں میں ٹھہرے تھے۔ لیکن اب ذکیہ کے ہمراہ اس کا خاوند نہیں بلکہ فرمانبردار بیٹا تھا جو سیرو تفریح کے لئے نہیں' اپنی ممی کی دیکھ بھال کے لئے آیا تھا۔

لندن میں انہوں نے دو ہفتے قیام کیا' وہیں ڈاکٹر سے مشورہ کیا' اس نے سارے ٹیسٹ لینے کے بعد کہا کہ بیگم صاحبہ کو کسی قسم کی دوا کی ضرورت نہیں' انہیں دل کا کوئی عارضہ نہیں۔ سینے' بازو یا گردن میں اٹھنے والا درد صرف ان کا واہمہ ہے۔ بس غذا میں احتیاط کیا کریں۔ مرغن غذاؤں سے پرہیز کریں۔ وزن کم کریں اور باقاعدگی سے سیر کیا کریں۔

ذکیہ اس ڈاکٹر کے معاینے اور مشورے سے بالکل مطمئن نہ ہوئی' اس کا گلہ یہ تھا کہ اسے نہ ہسپتال میں داخل کیا گیا' نہ آگے پیچھے نرسیں پھریں' نہ مرعوب کرنے والی مشین اس کے نتھنوں اور نسوں سے نتھی کی گئیں! یہ کیا تشخیص ہوئی کہ بلڈ ٹیسٹ' ای سی جی اور ایکسرے وغیرہ لے کر اور عام سی مشینوں کے سامنے لٹا کر ٹرخا دیا گیا! اس نے پرویز سے کہا۔

"دفع کر ان انگریزوں کو۔ انہوں نے پہلے کب ہمارا بھلا سوچا تھا جواب سوچیں گے۔ چل امریکہ چل کر چیک کروائیں گے...... ہاں؟ کتنے پیسے لگے اس چیک اپ پر"

"بس ممی بالکل معمولی' صرف ایک ہزار پونڈ۔"

"کتنے روپے ہوئے......."

"بس یہی کوئی پندرہ ہزار روپے۔"

"لعنت ہے ان پر اتنی رقم میں کیا خاک علاج ہوگا! پتہ ہے تجھے عذرا زلفی کی پیدائش کے لئے آئی تھی تو کتنا خرچ آیا تھا؟"

"نہیں' مجھے نہیں معلوم۔"

"اڑھائی لاکھ' پورے اڑھائی لاکھ...... شاپنگ کو چھوڑ کر چل امریکہ چلتے ہیں۔"

اس کے بعد وہ واشنگٹن ڈی - سی پہنچے' اعلیٰ ترین ہوٹل میں قیام کیا۔ گراں ترین ڈاکٹر سے وقت طے کیا اور اصرار کیا کہ تشخیص کے دوران ذکیہ کو ہسپتال میں رکھا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ذکیہ کوئی ایک ہفتہ ہسپتال میں رہی۔ تمام ٹیسٹ بڑی تفصیل سے لئے گئے۔ شوگر کے امکان کو رد کیا گیا' لیور (LIVER) کو ٹھیک پایا گیا' لنگز

(LUNGS) صحت یاب نظر آئے' دل کی تمام متوقع بیماریوں کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا گیا ور دو لاکھ روپے کے بل سمیت صحت مندی کا سرٹیفکیٹ جاری کر دیا گیا۔ پرویز نے ڈیڈی کو ممی کی ہیلتھ کے بارے میں مطلع کرتے ہوئے لکھا۔

"ڈیڈی ڈیر!

ممی آج ہی واشنگٹن ہسپتال سے فارغ ہوئی ہیں۔ ڈاکٹروں نے لیور' لنگز ' ہارٹ اور

دوسرے تمام امپارٹمنٹ پارٹس کا اچھی طرح معائنہ کیا ہے۔ تین چار ڈاکٹروں نے تمام ٹیسٹ رپورٹوں کا بغور مطالعہ کیا ہے اور میڈیکل بورڈ نے متفقہ طور پر فیصلہ دیا ہے کہ ممی کی ہیلتھ بالکل ٹھیک ہے' بس ذرا ویٹ کو کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے' مبارک

ہو ڈیڈی! آپ کا پرویز۔"
واشنگٹن کے بعد وہ چند روز کے لئے نیویارک رکے تو ایک دن میک اپ کرتے وقت ذکیہ کی نظر گوشت کے اس چھوٹے سے لوتھڑے پر پڑی جو بچپن ہی سے اسکی بائیں آنکھ کے کونے میں باجرے کے دانے کی طرح چپکا بیٹھا تھا۔ اس نے' وہیں میک اپ والے سٹول پر بیٹھے بیٹھے' پرویز کو بلوایا اور کہا "پرویز بیٹا! یہ دیکھ ذرا' یہ موکا یا پھنسی ہے....... اسے کٹواہی دے۔ ویٹ کچھ تو کم ہو جائے گا!"
"نہیں ممی' اس کا ویٹ سے کوئی تعلق نہیں لیکن آپ چاہتی ہیں تو ضرور اس کا بھی بندوبست کرتے ہیں"
اب اس بے ضرر گوشت کے ملکے سے ابھار کی خاطر بیگم ذکی دوبارہ ہسپتال پہنچ گئیں۔ ان کے اصرار پر ڈاکٹر نے ذکیہ کو ہسپتال میں داخل کر دیا۔ ڈاکٹر نے کسی ٹیسٹ وغیرہ کے بغیر ہی گوشت ابھار کو ہاتھ سے محسوس کرکے کہہ دیا کہ یہ کینسرس (CANCEROUS) نہیں ہو سکتا۔ یہ تو بالکل بے جان اور بے ضرر ہے۔ اسے نہ کاٹنے کی ضرورت ہے' نہ کاٹ کر لیبارٹری میں بھجوانے کی۔ لیکن گاہک کا اصرار دیکھ کر ڈاکٹر شیفرڈ نے ذکیہ کو دو دن کے لئے ہسپتال میں داخل کر لیا۔ معمولی سانشترد دکھا کر گوشت کو ننھا سا لوتھڑا ہٹا دیا' اوپر دوائی لگا دی اور اگلے روز تین ہزار ڈالر کابل وصول کرکے انہیں فارغ کر دیا۔
پرویز نے ڈیڈی کی ہدایت کے مطابق ذکیہ کے بارے میں دوسرا ہیلتھ بلیٹن یوں لکھا۔
"ڈیڈی ڈیر! آپ تو ہارٹ ٹربل کے متعلق WORRIED تھے۔ ہم نے یہاں نیویارک کے ایک ہائی کلاس سرجن سے کینسر کے متعلق بھی سرٹیفکیٹ لے لیا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ممی کی لیفٹ آئی کے پاس ایک چھوٹی سی GROWTH تھی جو دیکھنے میں HARMLESS لگتی تھی لیکن CANERROUS بھی ہو سکتی تھی۔ ہم نے وہ REMOVE کروا دی ہے۔ ممی اب بہت لائٹ محسوس کر رہی ہیں۔ اب وہ تمام بیماریوں سے پاک ہیں۔ ہم کل ہی کیلیفورنیا روانہ ہو رہے ہیں۔ ممی آپ کو سلام کہتی ہیں اور آپ کے لئے یہ لکھواتی

ہیں کہ شاپنگ واپسی پر ٹوکیو اور ہانگ کانگ سے کرونگی۔ آپ کا پرویز۔"
پھر وہ دو ہفتے کیلی فورنیا میں رہے اور ہوٹل میں ٹھہرے جہاں ملک صاحب ذکیہ کے ساتھ ہنی مون کے لئے ٹھہرے تھے۔ پرویز اور ذکیہ ہر اس جگہ گئے جس سے ذکیہ کی کوئی نہ کوئی یاد وابستہ تھی۔ انہوں نے ان یادگار مقامات پر تصویریں کھنچیں' ذکیہ نے بالوں سے ایک پن اتار کر کیلیفورنیا کی پارک میں پام کے پتوں پراردو میں اپنا نام کندہ کیا پھر پارک میں بڑے بنچ کے ایک کونے پر آئی لیشنر (EYE LASHES) والی پنسل سے اپنا نام لکھا اور اس کے نیچے تاریخ درج کی۔
جب ذکیہ نے اپنی تمام چھوٹی بڑی حسرتیں پوری کر لیں تو انہوں نے واپسی کا پروگرام بنایا اب وہ بحرالکاہل کے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے جاپان گئے' وہاں سے ہانگ کانگ اور پھر کراچی راستے میں ذکیہ نے خوب جی بھر کر شاپنگ کی' مرضی کے کپڑے اور قیمتی سے قیمتی پرلز خریدے' چند ڈیکوریشن پیس اپنے بیڈ روم کے لئے اور بہت سے پرفیوم اپنے ڈریسنگ ٹیبل کے لئے۔ اور نہایت مطمئن اور خوش ہو کر واپس حویلی پہنچ گئی۔
میراں بخش کی "اکلوتی" بیوی شریفاں روز بروز سوکھتی جا رہی تھی۔ اس نے بابا چپ شاہ کی خانقاہ کی راکھ ملنے کے علاوہ کئی پیروں فقیروں سے تعویذ گنڈے لئے تھے لیکن کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ گاؤں میں کام کاج کی زیادتی خوراک کی کمی کی وجہ سے اکثر عورتیں وقت سے پہلے ہی بوڑھی ہو جاتی تھیں اور بہت سی گھس گھس کر تپلی ہو جاتی تھیں لیکن شریفاں کی حالت دوسروں سے بہت مختلف تھی۔ وہ آہستہ آہستہ سوکھتی جا رہی تھی۔ بھوک ویسے ہی کم لگتی تھی۔ جب گھر میں بھینس ہوتی بھی تو دودھ یا مکھن کو یہ کہہ کر ہاتھ نہیں لگاتی تھی کہ میرا جی نہیں چاہتا۔ پتہ نہیں واقعی اس کا جی نہیں چاہتا تھا یا وہ بچت کرنا چاہتی تھی' بہرحال اب صورتحال یہ تھی کہ شریفاں سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی' اچھے نکلتے ہوئے قد پر اب صرف اس کی نکیلی ناک ہی نمایاں نظر آتی تھی۔ چھاتیاں سوکھ کر لٹک چکی تھیں اور کاٹن کی قمیض گلے سے گھٹنوں تک'

کسی نشیب و فراز کا سامنا کئے بغیر یوں لٹکی رہتی تھی جیسے لکڑی کے پھٹے پر کپڑا لٹکایا گیا ہو۔ اس کے سر کے بال بہت مختصر اور زیادہ تر سفید تھے۔ مہینے دو مہینے بعد باسی لسی سے بال دھو کر کنگھی کرتی تو سارے بال کھوپڑی کیساتھ چپک جاتے اور پیچھے چوٹی کے لیے بمشکل بالشت بھر بال بچتے۔ ان بالوں کے آخر میں کبھی وہ چھوٹا سا پراندہ ڈال لیتی' کبھی پراندے کی جگہ پرانے کپڑے کی کترن باندھ لیتی اور کبھی ان کے بغیر ہی بالوں کو ہلکی گانٹھ لگا دیتی تا کہ بکھرنے نہ پائیں وہ اسی حلئے میں چڑیوں' کوؤں اور جنگلی کبوتروں کو دانہ ڈالتی رہتی اور اپنے مقدر پر قانع رہتی۔

اس کے پاؤں کی نسیں بہت ابھری ہوئی تھیں۔ ذکیہ میں جتنے ابھار تھے' خوش خوراکی اور بسیار خوری کی وجہ سے تھے' اور شریفاں کے سوکھے پن میں اس کے افلاس اور کم مائیگی کا دخل تھا۔ اس کے چہرے سے پاؤں تک گوشت کا کوئی واضح لوتھڑا نظر نہ آتا تھا یہاں تک کہ اس کے پاؤں کی رگیں اور نسیں بڑی آسانی سے گنی جا سکتی تھیں۔ ایڑیوں کے پیچھے خشکی اور میل کی وجہ سے جلد جگہ جگہ سے پھٹ چکی تھی اور جلد کی یہ دراڑیں سردیوں میں درد کرنے لگتی تھیں۔ وہ درد کا علاج یوں کرتی کہ جب کبھی مکھن گرم کرکے گھی تیار کرتی تو پگھلے ہوئے مکھن کی سفید جھاگ تنکے سے لگا کر ان دراڑوں پر ڈالتی' کبھی پھٹی ہوئی جلد پر گرما گرم جھاگ پڑنے سے وہ درد سے بلبلا اٹھتی اور کبھی نیم گرم جھاگ سے متاثرہ جگہ پر اچھی ٹکور ہو جاتی جس سے اسے کچھ آرام آجاتا۔ اسے پچھلے کئی برس سے کسی نے مکمل جوتا (پنجے سے ایڑی تک) پہنے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہر جگہ اور ہر وقت کسی کے متروک سینڈل ہی گھسیٹتی رہتی جن کا پچھلا حصہ گھس گھس کر غائب ہو گیا تھا۔ اگر ماسی نوراں' پھلاں یا کوئی عورت اسے جوتا خریدنے کو کہتی تو وہ پھٹی ہوئی ایڑی کا بہانہ کرکے کہتی کہ میں دکھتی ایڑی کی وجہ سے جوتا پہن نہیں سکتی' حالانکہ جوتا نہ خریدنے کی اصل وجہ پیسوں کی کمی تھی۔

خراب ایڑی معمولی بات نہیں تھی' اصل تکلیف تو اندر کی کوئی بیماری تھی جو چپکے چپکے اسے کھائے جار رہی تھی۔ اب تو اسے کئی دن سے متواتر بخار بھی ہو رہا تھا اور جسم بھی کام کرنے سے جواب دے رہا تھا۔ وہ اب باہر نکل کر پرندوں کو روٹی کے باسی ٹکڑے بھی نہیں ڈال سکتی تھی۔ کئی عادی چڑیاں اس کے صحن میں اترتیں' پھدک پھدک کر اس کی چکی تک آتیں اور پھر مایوس ہو کر اڑ جاتیں۔ ایک دن شریفاں نے میراں بخش سے کہا۔

"میراں بخشا! میں یونہی چڑ چڑ کر مر جاؤں گی' کیوں نہیں کچھ کرتا تو میرے علاج کے لیے؟"

"پچھلی پانچ جمعراتوں سے بابا چپ شاہ کی خانقا پر دیا جلا رہا ہوں سات جمعراتوں سے مسجد میں پانی بھر رہا ہوں...... اور کیا کروں؟"

"مجھے شہر میں کسی ڈاکٹر کے پاس لے چل۔"

"ڈاکٹر کے پاس! جیسے تو جدی پشتی ڈاکٹری علاج ہی کرواتی آئی ہے۔ تعویذ گنڈے کر دیکھے' حکیم صاحب سے تین دفعہ دوائی لا کر دے چکا' ابھی ساڑھے تین روپے بقایا ہیں اب یہ بیماری اللہ کی طرف سے آئی ہے تو اسے سہہ لے جس کے پرندوں کو اتنا خیال کرتی تھی وہ تیرا خیال بھی رکھے گا.....ڈاکٹری علاج! پتہ ہے ڈاکٹری علاج کتنے میں ہوتا ہے؟"

"مجھے کیا پتہ! مجھے تو صغراں نے کہا تھا کہ شہر سے علاج کرا' ایکسرا نکلوا' چھاتی میں بلغم جم جائے تو اس نے ٹی بی ہو جاتی ہے' پورا علاج کروا......."

"جس نے تجھے ڈاکٹری علاج کا مشورہ دیا ہے اس نے تجھے یہ نہیں بتایا کہ اس پر خرچ کتنا ہو گا۔"

"کیا ڈاکٹر ہم سے بھینس مانگ لے گا یا کوٹھا رہن رکھوا لے گا۔ یہی دس بیس روپے کی بات ہے۔ اسحاق کے اونٹ کے دو پھیرے ہی سہی۔"

"واہ واہ' کیا خوب حساب کیا ہے! وہ تیس چالیس روپے تو لے گا فیس' صرف دیکھنے

کی' پھر کروائے گا ایکسرے' چالیس پچاس روپے لگیں کے اس پر خون ٹیسٹ' پیشاب ٹیسٹ اور پتہ نہیں کیا کیا ٹیسٹ دوائی کی نوبت آنے سے پہلے ہی دو تین سو روپے اٹھ جائیں گے۔ کہاں سے لاؤں اتنے پیسے؟"

"میریا! جان سے عزیز کیا چیز ہوتی ہے' لگا دے چند پیسے میری جان کی خاطر' گانٹھ کے پکے' سدا کے خسیس!"

"تو تو کچی لسی کی طرح بڑھتی ہی جاتی ہے۔ بات کنجوسی کی نہیں' خرچے کی ہے۔ ہم سے نہیں برداشت ہوتا یہ خرچہ اونٹ کی کمائی تمہارے علاج پر لگا دی تو کھائیں گے کیا' زمین کی کمائی تو مہینے کیا پندرہ دن کے لیے بھی کافی نہیں ہوتی۔ کہاں بیٹھی ہو تم' صغراں و غراں کی باتوں پر نہ جایا کرو' یہ تو دوسروں کا گھر جلا کر تماشا دیکھنے والے لوگ ہیں۔"

"اچھا' میراں بخشا تیری مرضی!"

وہ یہ کہہ کر چپ ہو گئی۔ بخار رفتہ رفتہ تیز ہونے لگا۔ تینوں مرد گھر سے باہر تھے۔ گھومنے پھرنے والی مرجان بھی کالی شلوار کے ساتھ سفید پتلا کرتہ پہن کر اور منہ ہاتھ دھو کر حسب معمول گاؤں کے دورے پر نکلی ہوئی تھی۔ گھر میں صرف بیٹی شیداں تھی جو کبھی ماں کو پانی کا گھونٹ پلاتی' کبھی سردباتی اور کبھی گھڑے کے پانی میں پٹیاں بھگو کر اس کے ماتھے پر رکھتی۔ جب کوئی افاقہ نہ ہوا تو شیداں نے ماں سے کہا "سنا ہے برف میں بھگو کر پٹیاں رکھی جائیں تو بخار جلدی اتر جاتا ہے۔"

"کہاں سے لائے گی برف تو......."

"حویلی والوں سے۔"

"کیا باتیں کرتی ہو' شیداں۔ وہاں تو ہم میں سے جب بھی کوئی گیا ہے' صفائی دینے ہی گیا ہے۔ تمہارا باپ بھی دو تین بار پیش ہو چکا ہے۔ ایک دفعہ اسحاق کا اونٹ چرتا چرتا ملک صاحب کے کھیتوں میں چلا گیا تھا اور دوسری دفعہ فرمان علی ماہیا گاتا ہوا کھیتوں سے آ رہا تھا اور آواز ملک صاحب کے کانوں میں پڑ گئی تھی۔ اب تو تیرے بھائی ادھر

کا رخ بھی نہیں کرتے تو کیا ان غیرت مند بھائیوں کی بہن ہو کر حویلی سے برف مانگنے جائیگی؟ رہنے دے، ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

تھوڑی دیر بعد شریفاں کی سہیلی صغراں اس کا پتہ کرنے آئی۔ اس نے ڈاکٹری علاج والی تجویز دہرائی لیکن شریفاں نے اپنی مجبوری ظاہر کردی۔ صغراں نے دوسرا نسخہ یہ بتایا کہ نیم کے پتے ابال کر ان کا رس پی، پیالہ دو پیالے پینے سے فوراً افاقہ ہو جائے گا۔ شیداں نے بتایا کہ وہ یہ علاج تو دو تین دفعہ آزما چکی ہے۔ پھر صغراں نے تجویز کیا کہ شریفاں کو پچھلی کوٹھڑی میں لحافوں میں لپیٹ کر چھپا دیا جائے اور صحن میں دھوپ میں چارپائی بچھا کر اس پر چرخہ رکھا جائے اور چرخے پر چادر بچھا دیجائے۔ اس کا فلسفہ یہ تھا کہ بخار باہر سے آیگا، چرخے کی مریض سمجھ کر اس سے چمٹ جائیگا اور شریفاں اندر چھپی رہے گی۔ شام کو نکالیں گے تو شریفاں کا بخار اتر چکا ہوگا۔

چنانچہ شیداں نے یہی طریقہ آزمایا۔ گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں چرخے پر چادر ڈال کر صحن میں رکھ دیا اور ماں کو لحافوں میں لپیٹ کر پچھلی کوٹھڑی میں چھپا دیا، اوپر سے کنڈی چڑھا دی کہ کوئی اندر پتہ کرنے نہ جائے ورنہ بخار بھی اس کیساتھ اندر چلا جائیگا۔

شام تک چرخے اور اس پر بچھی ہوئی چادر کو خوب بخار، چڑھ چکا تھا اور ماسی صغراں کا نسخہ کامیاب دکھائی دے رہا تھا اندر جا کے جسم کو ہاتھ لگایا تو اس کا بخار اتر چکا تھا۔

وہ وہیں سے خوشی میں چیخ اٹھی "ابا، ابا! ماں کا بخار اتر گیا ہے۔" اتنے میں میراں بخش "شکر ہے خدا یا، شکر ہے خدا یا، کہتا اندھیری کوٹھڑی میں گیا۔ شریفاں کو دو چار آوازیں دیں، جواب نہ ملا تو اسے ہاتھ لگا کر ہلایا، پھر جھنجھوڑا۔ وہ کبھی کی ٹھنڈی ہو چکی تھی ہمیشہ کے لیے!

میراں بخش "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھتے ہوئے باہر نکل آیا اور شیداں لمبے لمبے بین کر کے رونے لگی۔

شام کی نماز سے قبل شریفاں کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

زلفی جب چار سال کا ہوا تو اسے یورپین اکیڈمی کے جونیئر سیکشن میں داخل کرا دیا گیا۔ یہ اکیڈمی شانتی نگر سے کوئی تین سو میل دور ایک صحت افزا پہاڑی مقام پر واقع تھی اور اس میں صرف بڑے بڑے افسروں' کارخانہ داروں اور جاگیرداروں کے بچے پڑھتے تھے۔ پرویز علی خان' قدیر علی خان' شعیب علی خان اور ضمیر علی خان بھی اچھے سکولوں اور کالجوں میں پڑھے تھے لیکن زلفی کے لیے ملک صاحب نے خاص اہتمام کیا تھا کیونکہ وہ عذرا کا اکلوتا اور ملک صاحب کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ اسے وہ سب کچھ دینا چاہتے تھے جس کی کوئی انسان خواہش کر سکتا ہے۔ وہ چہیتا بھی تھا' اکلوتا بھی اور چھوٹا بھی!

شانتی نگر سے اکیڈمی تک پہنچنے میں کوئی پانچ گھنٹے لگتے تھے جن میں سے چار گھنٹوں کا سفر میدانی علاقے میں تھا اور آخری ایک گھنٹے کے لیے پہاڑوں کے درمیان بل کھاتی سڑکوں سے گذرنا پڑتا تھا شاید کسی مقام کی قدر و منزلت کسی حد تک اس چیز میں بھی مضمر ہوتی ہے کہ اس تک باآسانی پہنچا نہ جا سکے۔

یہ بل کھاتی سڑک بالاخر اکیڈمی کے وسیع گیٹ تک پہنچ جاتی تھی جو موٹے موٹے پہاڑی پتھروں سے چنا گیا تھا اور پتھروں کے جوڑوں پر سیمنٹ لگا کر ان پر چونے کی سفید لکیریں پھیر دی گئی تھیں۔ گیٹ سے اندر جانے والی دونوں سڑکیں پختہ تھیں لیکن ذرا پتلی۔ ایک سڑک اکیڈمی کی مین بلڈنگ کی طرف جاتی تھی جہاں پرنسپل صاحب کا دفتر اور کلاس رومز وغیرہ تھے اور دوسری سڑک اکیڈمی کے رہائشی حصے کی طرف مڑتی تھی جہاں چار ہاؤسز (HOUSES) میں بچے رہتے تھے۔ انہی ہاؤسز میں سے ایک "شاہین ہاؤس" تھا جس میں زلفی کو جگہ دی گئی۔

ان ہاؤسز کے پیچھے اساتذہ کے رہائشی بنگلے تھے۔ پرنسپل صاحب کا بنگلہ' ذرا فاصلے پر پہاڑی کی چوٹی پر' واقع تھا جہاں سے وہ باسانی اکیڈمی پر نظر رکھ سکتے تھے اور شام کو پہاڑی سے اتر کر کبھی پیدل اور کبھی کار پر اکیڈمی میں آ جاتے تھے۔

سوئمنگ پول' باسکٹ بال کورٹس' ٹینس کورٹس' ہاکی' فٹ بال اور کرکٹ کے میدان

اور دوسری سہولتیں اکیڈیمک بلاک اور اکیڈیمی کے رہائشی حصے کے درمیان واقع تھیں اور شام کو زیادہ تر گہما گہمی اسی جگہ ہوتی تھی۔ خوبصورت اور صحت مند بچے پروگرام کے مطابق گیمز کھیلتے یا سوئمنگ کرتے۔ اساتذہ بھی کھیل کی پتلون اور بلیزر پہنے ان کے ساتھ ہوتے' اکثر استادوں کے بلیزروں کی جیب پر کسی نہ کسی گیم میں کلر حاصل کرنے کا نشان تھا۔ ان میں سے دو تو سابقہ اولمپین تھا۔

ان ڈور تقریبات کے لیے ایک خوبصورت ہال مخصوص تھا جس کی سٹیج پر لال رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا اور سامنے جھالر والے تین لمبے لمبے ریشمی پردے لٹکے ہوئے تھے جو ڈرامہ وغیرہ سٹیج کرتے وقت باری باری کھینچے جاتے تھے۔ ہال کی دیواروں پر بڑے بڑے لوگوں کی تصویریں لٹکی ہوئی تھیں جن میں سر سید احمد خان' علامہ اقبال اور قائد اعظم محمد علی جناح کے پورٹریٹ نمایاں تھے۔

زلفی اس ماحول میں بہت خوش تھا۔ گورنس کے پاس ابتدائی چند سال گذارنے سے وہ نہ صرف انگریزی میں طاق ہو گیا تھا بلکہ اسے اعلیٰ سوسائٹی کے آداب بھی آگئے تھے وہ گرمیوں میں نیوی بلیو نیکر' نصف بازو والی سفید قمیض اور اکیڈیمی کی دھاری دار ٹائی پہن کر بڑے سمارٹ طریقے سے گھومتا پھرتا۔ جو استاد یا سینئر اسٹوڈنٹ سامنے آتا' اسے "سر" کہہ کر سلام کرتا۔ کلاس روم میں دل لگا کر پڑھتا۔ اپنے ہاؤس میں صاف ستھرا رہتا۔ شام کو گیمز میں حصہ لیتا اور پھر شاور کے نیچے یا ٹب میں غسل کرکے ڈریسنگ گاؤن پہن کر پڑھنے بیٹھ جاتا۔ ننھی سی میز پر منا سا ٹیبل لیمپ لگا ہوتا' خوبصورت ٹیبل کلاتھ پر ایک طرف کتابیں سجی ہوتیں اور دوسرط طرف کاپیاں۔ وہ عموماً STUDY HOURS کے دوران خوب جی لگا کر پڑھتا اور کبھی کبھی اس کا ہاؤس ماسٹر راؤنڈ لگاتے ہوئے اس کے کمرے میں آجاتا تو یہ بڑی مستعدی سے کھڑا ہو کر انہیں "گڈایوننگ سر" کہتا۔ ہاؤس ماسٹر کھڑے کھڑے اس کا حال احوال پوچھ کر چلا جاتا۔

زلفی کو ٹینس اور سوئمنگ کا بہت شوق تھا۔ سوئمنگ ٹرنکس کے لیے ہر ہاؤس کا الگ الگ رنگ تھا۔ زلفی کے ہاؤس کا رنگ اورنج تھا اور اس کے پاس اورنج کلر کے بارہ

سوئمنگ ٹرنک تھے۔ وہ اپنے گورے جسم پر اورنج ٹرنک پہن کر جب سوئمنگ پول کے نیلے پانی میں مچھلی کی طرح تیرتا تو بہت ہی پیارا لگتا۔ سوئمنگ پول کی دیواریں سفید ماربل کی بنی ہوئی تھیں اور زلفی تیرتے تیرتے جب تالاب کے کنارے میں پہنچتا تو پھرتی سے پلٹ کر اپنا پاؤں ماربل کی دیوار سے لگا کر آگے کو جست لگاتا تو غیر معمولی رفتار سے آگے بڑھ جاتا۔ بعض اوقات وہ واٹر پولو کھیلنے کے لیے دوستوں کو بھی دعوت دے دیتا۔ وہ خوب کھیلتے' صاف ستھرا صحت بخش پانی ایک دوسرے پر پھینکتے' شرارتیں کرتے اور جب گھنٹی بجتی تو نچڑتے جسموں کے ساتھ پول کے کنارے پر کھڑے ہو جاتے۔ اکیڈیمی کے ملازم نرم نرم تولیے زلفی اور اس کے ساتھیوں کو تھماتے اور جب وہ اپنے جسم پونچھ لیتے تو تولیے واپس لیکر انہیں ڈریسنگ گاؤن پہنا دیتے اور وہ اس لباس میں اپنے اپنے ہاؤس کو روانہ ہو جاتے۔

پڑھائی اور کھیلوں کے علاوہ اکیڈیمی میں رائیڈنگ (گھڑ سواری) شوٹنگ' ٹریکنگ اور ہائکنگ وغیرہ پر بھی بہت توجہ دیجاتی تھی اور اکیڈمی کے اساتذہ بچوں کے گروپ بنا کر انہیں ان مردانہ مشغلوں بھی تربیت دیتے۔ پہلے چار پانچ سال تو زلفی کم عمر ہونے کی وجہ سے ان میں حصہ نہ لے سکا لیکن پری کیمبرج میں پہنچ کر وہ اس طرف بھی خاصی توجہ دینے لگا۔

اکیڈیمی کے کے پرنسپل بچوں کے والدین کو سال میں دو مرتبہ دعوت دیتے ایک دفعہ تعلیمی سال کے وسط میں تا کہ وہ فرداً فرداً اپنے بچے کی نشو نمائش' اس کے خصائل' اس کی پڑھائی' غیر نصابی سر گرمیوں میں اس کی کارکردگی اور مستقبل سے متعلق منصوبوں پر کلاس ٹیچر' ہاؤس ماسٹر اور اگر چاہیں تو پرنسپل صاحب سے تبادلہ خیال کر سکیں' اور دوسری مرتبہ سال تقریب میں مدعو کئے جاتے جہاں وہ عملی طور پر بچوں کو مختلف سرگرمیوں میں حصہ لیتے دیکھتے' انعام پاتے دیکھ کر خوش ہوتے اور تقریب کے بعد ایک ہفتے کی چھٹیوں کے لیے اپنے اپنے بچے کو ساتھ لے جاتے۔

ملک جابر علی خان ہر بار عذرا کو ساتھ لے کر اکیڈیمی جاتے' زلفی کی نشوونمائش دیکھتے' اسے نصابی اور غیر نصابی سر گرمیوں میں طاق دیکھ کر خوش ہوتے اور پھر امپالا کار کی پچھلی سیٹ پر برا جمان ہو کر شانتی نگر واپس چلے آتے۔

بابا کلو کا نواسہ اور بوٹا خان کا بیٹا رحم علی پانچ سال کا ہوا تو گھر میں جھگڑا کھڑا ہو گیا کہ اسے روایت کے مطابق ڈھور ڈنگر چرانے پر لگایا جائے یا سکول میں داخل کرایا جائے۔ جس طرح ابتدائی پانچ برسوں میں اس کی تربیت ہوئی تھی' اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا مقدر ڈنگر چرانا ہی ہو گا کیونکہ جب وہ چند مہینوں کا تھا تو گندے صحن میں گندی نالیوں میں لڑھکتا پھرتا تھا' اس کی ناک اکثر بہتی رہتی تھی جو وہ کبھی بازو سے اور کبھی ہاتھ سے پونچھ لیتا تھا۔ جب وہ ذرا بڑا ہوا تو ایک چھوٹی سی قمیض پہن کر نیم برہنہ پھرتا رہتا' جھولی میں کبھی بیری کے بیر اور کبھی باجرے کے کچے دانے ڈال کر کھاتا رہتا۔ ایک دفعہ تو ایک موٹا مگر کچا بیر اس کے حلق میں پھنس گیا اور سکینہ خاصی پریشان ہوئی لیکن بابا کلو نے بسم اللہ پڑھ کر اس کی گردن پر مکا مارا تو بیر رحم کے حلق سے باہر نکل آیا' اس کیساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔

جب وہ ساڑھے پانچ سال کا ہوا تو گھر والوں کی مخالفت کے باوجود بوٹا خان اسے پرائمری سکول میں داخل کرا آیا کیونکہ اس نے رحم علی کی پیدائش پر قسم کھائی تھی کہ وہ خود بھوکا رہ لے گا لیکن رحم علی کو تعلیم ضرور دلوائے گا۔ کپڑے کے بنائے ہوئے بستے میں پہلی جماعت کا قاعدہ ڈال کر اور ہاتھ میں تختی پکڑ کر رحم علی سکول جانے لگا۔

اس سکول کی عمارت دو کمروں پر مشتمل تھی۔ دو کنال کے ٹکڑے کے چاروں طرف کانٹے دار ٹہنیوں کی باڑ لگی ہوئی تھی۔ چند ٹہنیاں رسی سے باندھ کر گیٹ کی جگہ رکھ دی گئی تھیں۔ سب سے پہلے جو استاد یا طالبعلم آتا "گیٹ کو گھسیٹ کر ایک طرف کر دیتا اور چھٹی کے وقت اسے دوبارہ اپنی جگہ پر رکھ لیا جاتا تاکہ کتے بلے یا ڈھور ڈنگر سکول کے احاطے میں داخل نہ ہو سکیں۔ لیکن احتیاط کے باوجود سکول کے صحن میں آوارہ

جانوروں کی گندگی کا کوئی نہ کوئی نشان ضرور نظر آجاتا' بعض اوقات تو کوئی بھینس بھی باڑ پر وزنی پاؤں رکھ کر سکول میں چلی آتی' خوب جی لگا کر سیر کرتی اور جاتے وقت اپنے گوبر سے اپنی آمد کا نشان چھوڑ جاتی۔ لیکن گاؤں کے بہت سے بچے ایسے تھے جنہیں سکول میں قدم رکھنا کبھی نصیب نہ ہوا۔

اسکول کی کل کائنات تین درخت اور چار استاد تھے۔ ان دنوں پرائمری سکول میں صرف چار جماعتیں ہوتی تھیں اور ہر جماعت کے لیے ایک استاد مقرر تھا' لیکن استاد سے کہیں زیادہ درختوں کی اہمیت تھی جو گرمیوں میں سائے کا واحد ذریعہ تھے۔ اکثر کلاسیں اسی سائے میں لگتی تھی اور ڈھلتے بڑھتے سائے کے مطابق آگے پیچھے ہوتی رہتی تھیں' البتہ موسم سرما میں بات دوسری تھی جب بچے خود جھاڑو دے کر دھوپ والی جگہ صاف کر لیتے تھے اور سورج کی روشنی اور تمازت میں حمد و نعت سے اپنا سبق شروع کرتے تھے۔

استادوں میں گلستان خان ہیڈ ماسٹر تھے جبکہ باقی تین اساتذہ کے نام تھے برکت علی' نیاز احمد اور عنایت اللہ! گلستان خان پڑوسی گاؤں سے صبح صبح سائیکل پر آتے تھے اور چھٹی کی گھنٹی بجنے کے کوئی آدھ گھنٹہ بعد ساری چیزیں اپنے سامنے سنبھال کر جاتے تھے۔ برکت علی اور نیاز احمد شانتی نگر ہی کے رہنے والے تھے اور مڈل کرنے کے بعد یہیں ٹیچر لگ گئے تھے۔ اب وہ دونوں پرائیویٹ طور پر میٹرک کی تیاری کر رہے تھے ان کا ارادہ تھا کہ میٹرک کے بعد وہ منشی فاضل یا مولوی فاضل کریں گے اور پھر انگریزی کا امتحان دے کر ایف اے اور بی اے کی اسناد حاصل کر لیں گے۔ عنایت اللہ شانتی نگر کا نواسہ تھا' یعنی اسی گاؤں کی ایک بیٹی کلثوم ساتھ کے گاؤں میں بیاہی ہوئی تھی اور اس کا بیٹا عنایت اللہ میٹرک پاس کرکے ان ٹرینڈ ٹیچر کے طور پر شانتی نگر میں کام کر رہا تھا۔ وہ کبھی شانتی نگر اپنے ننھیال میں رک جاتا اور کبھی دولت آباد میں اپنی ماں کے پاس چلا جاتا۔ اسے بھی مزید تعلیم پانے اور آگے بڑھنے کا بہت شوق تھا لیکن وسائل ناپید تھے۔

رحم علی کی جماعت میں ۳۶ لڑکے تھے جن میں سے شیدا' کامو' فرید اور جیرا اس کے پکے دوست بن گئے۔ وہ اکٹھے ہی ٹاٹ یا بوری کا ٹکڑا بچھا کر زمین پر بیٹھتے' اکٹھے ہی تختیاں دھونے جاتے اور پھر اکٹھے ہی بستے گلے میں ڈال کر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے۔

دوسری' تیسری اور چوتھی جماعت میں بیس پچیس لڑکے تھے جن میں علی الصبح اسمبلی میں تلاوت کرنے والا نصیب اللہ' نعت پڑھنے والا عجائب خان اور ہر پیریڈ کے بعد گھنٹی بجانے والا محمد شریف زیادہ نمایاں تھے۔ سکول کے سبھی لڑکے ان تینوں کو جانتے تھے اور ان کی عزت کرتے تھے۔

محکمہ تعلیم اس دور افتادہ سکول کی طرف بہت کم توجہ دیتا تھا۔ وہاں فرنیچر تو کیا ٹاٹ تک موجود نہ تھے۔ ہر لڑکے کی ڈیوٹی تھی کہ وہ بیٹھنے کے لیے اپنے گھر سے بوریا لایا کرے۔ رحم علی بھی عموماً کپڑے کا کوئی نہ کوئی ٹکڑا بوریے کے نام پر اٹھا لاتا لیکن سردیوں میں ٹھنڈی زمین پر بچھانے سے یہ پھٹا ہوا چیتھڑا بہت ٹھنڈا لگتا۔ کا موجو نسبتاً بہتر گھرانے سے تعلق رکھتا تھا' باقاعدگی سے نئی بوری ہمراہ لاتا۔ رحم علی کے لیے اور اپنے لئے پوری طرح پھیلا کر بوری بچھاتا اور دونوں کے بستے جوڑ کر ان پر رکھ دیتا تا کہ کوئی اور لڑکا جگہ پر قبضہ نہ کرنے پائے۔ ان کیساتھ شیدا اور فرید بیٹھتے۔

فرید تو طبعاً شریف لڑکا تھا لیکن شیدا ہر وقت شرارت پر تلا رہتا۔ اگرچہ وہ رحم علی کا دوست تھا لیکن اسے چڑانے کے لیے کبھی اس کی دوات میں سے ڈوبا لگا لیتا اور کبھی تختی لکھنے والا قلم چھپا دیتا۔ رحم علی نے اکثر شرارتیں شیدے سے سیکھیں اور پھر وہ مل کر دوسرے لڑکوں کو چھیڑنے لگے۔

چھٹی کے بعد رحم علی اور اس کے ساتھیوں کا سب سے بڑا کام اپنے اپنے گھر کے مویشیوں کو گاؤں کے مشترکہ تالاب پر لے جانا' پانی پلانا' بھینسوں کو نہلانا' خود نہانا اور پھر مویشیوں کو ہانک کر اپنی اپنی کھرلی تک پہنچانا تھا۔ رحم علی' شیدا' کامو اور جیرا پروگرام بنا کر تقریباً ایک ہی وقت جوہڑ پر آتے۔ فرید کے گھر کوئی جانور نہیں تھا اس لئے وہ عموماً

غائب رہتا لیکن کبھی کبھی شوقیہ طور پر وہاں آنکلتا۔ بیل تو پانی پی کر جوہڑ سے پیچھے ہٹ جاتے لیکن بھینسیں خواہ وہ شیدے کی ہوں' رحم علی کی یا جیرے کی عموماً بلا تکلف پانی کے اندر چلی جاتیں۔ بیل جوہڑ کے اردگرد ہریالی سے جی بہلاتے رہتے اور بھینسیں پانی میں بیٹھ کر جگالی کرنے لگتیں۔ رحم علی اور اس کے ساتھی تہبند اتار کر کنارے میں پھینکتے اور خود پانی میں ننگ دھڑنگ چھلانگ لگا دیتے۔ وہ کبھی تیرتے ہوئے اور کبھی زیر آب کیچڑ میں چلتے ہوئے اپنی اپنی بھینس تک جا پہنچتے اور اس پر پانی پھینک پھینک کر اسے چمکانے لگتے' کبھی شرارت سے بھنس کی پیٹھ پر جا بیٹھتے تو وہ اچانک کروٹ بدل کر انہیں پیٹھ سے اتار پھینکتی۔ یہ مشغلہ خاصی دیر تک جاری رہتا۔

کئی دفعہ گاؤں کی عورتیں یا مرد اپنے مویشی لاتے تو ان میں سے بھی کوئی نہ کوئی بھینس پانی پیتی پیتی جوہڑ کے اندر چلی جاتی اور اس کا مالک کنارے پر کھڑا اسے واپس بلانے کی ناکام کوشش کرتا رہتا۔ بھینس ایسی التماس کو عموماً سنی ان سنی کر دیتی اور ہم نسلوں کیساتھ جا لیٹتی ایسے موقعوں پر رحم علی اور اس کے ساتھی دیہاتیوں کے بڑے کام آتے۔ کنارے سے آواز آتی "پتر رحم علی! ذرا بھنس تو باہر نکال دے" اور رحم علی درخت کی شاخ سے چابک کا کام لیتے ہوئے مطلوبہ بھینس کو جوہڑ سے ہانک کر اس کے مالک کے سپرد کر دیتا۔

ایک دفعہ رحم علی اپنے ساتھیوں سمیت اسی طرح جوہڑ میں ڈیوٹی دے رہا تھا پنڈلی پر کسی چیز نے کاٹ لیا۔ وہ چیخ کر شیشم کے تنے پر جا بیٹھا جو ایک عرصے میں جوہڑ میں اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اس نے متاثرہ ٹانگ کھینچ کر تنے پر رکھی تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ ایک جونک اس کی پتلی سے پنڈلی میں منہ ڈالے اس کا خون چوس رہی ہے۔ اس کے ساتھی بھی یہ منظر دیکھ کر حیران و پریشان تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ رحم علی رو رہا تھا اور جونک متواتر اس کا خون چوسے جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جونک پھول کر ملک جابر علی کی مونچھ کے برابر ہو گئی۔ شیدے نے ٹہنی

کی مدد سے جونک کو پنڈلی سے چھیل کر ہٹایا تو وہ خون سے سرشار ہو کر خود بخود جوہڑ
میں گر گئی۔ خون چوسنے کا یہ نشان ساری عمر رحم علی کی پنڈلی پر برقرار رہا۔

جائیداد بنانے' شادیاں رچانے رعب جمانے کے علاوہ ملک جابر علی کا سب سے بڑا شوق
شکار کھیلنا تھا جسے پورا کرنے کے لیے گھوڑے' کتے اور مزارعے ان کے کام آتے تھے۔
وہ ہفتے میں کم از کم دوبار دریا کے پار شکار کھیلنے جاتے۔ ملازموں کی ایک ٹولی علی الصبح
پیدل دریا پار کرکے اونچی گھا' خود رو جھاڑیوں اور سرکنڈے کے درختوں میں پہنچ جاتی
تا کہ پرندوں اور جانوروں کو ملک صاحب کی گولیوں کے لیے تیار کر سکیں۔ ملک صاحب
ناشتہ وغیرہ کر کے سورج چڑھنے سے ذرا پہلے برجس پہنتے' لمبے شکار بوٹ گھٹنوں تک
چڑھاتے' اوپر چمڑے کی جیکٹ پہنتے۔ اگر سردی زیادہ ہوتی تو جیکٹ کی بجائے (چیک
کوٹ) پہنتے جس کی کہنیوں پر براؤن رنگ کا چمڑا چڑھا ہوا تھا۔ سر پر ہنٹنگ کیپ (CAP
HUNTING) اور چہرے پر بہت سی حاکمیت سجاتے اور مشکی گھوڑے پر سوار ہو کر حویلی
کے گیٹ سے باہر نکل جاتے۔ ان کے ساتھ تین شکاری کتے ٹیری' ٹیپو اور ٹائیگر اور
تین مزارعے پھتو' کرما اور قربان پیدل چلتے۔ شکاری کتوں کی زبانیں لٹک رہی ہوتیں
لیکن مزارعوں کی زبانیں دائمی طور پر بند تھیں۔ شکاری کتے جو مزارعوں کی نسبت سبک
رفتار تھے کبھی آگے اور کبھی دائیں بائیں بھاگ جاتے اور تھوڑی دیر بعد پھر ملک صاحب
کے گھوڑے کے آس پاس آجاتے لیکن پھتو' کرمے اور قربان کے لیے ملک صاحب
کے گھوڑے اور کتوں کا ساتھ دینا مشکل ہوتا۔ قربان تو پھر نوجوان تھا کبھی دوڑ لیتا کبھی
تیز چلنے لگتا اور یوں گھوڑے کے آگے یا پیچھے پہنچتا لیکن پھتو اور کرما ہانپنے لگتے۔
بہرحال وہ جوتیاں چٹخاتے' خاک اڑاتے اور جھاڑیں کھاتے آگے ہی آگے بڑھتے رہتے
حتیٰ کہ دریا کا مغربی کنارا آ جاتا۔ وہاں ان ملازموں کو فارغ کر کے کھیتوں میں کام
کرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا اور ملک صاحب دریا کے پار ملازموں کی دوسری ٹولی کو

سرگرم عمل دیکھ کر گھوڑا دریا میں ڈال دیتے۔ دریا کا پاٹ صرف موسم برسات میں لبالب بھرا ہوتا ورنہ اس کا پانی یا تو جھیلوں میں بٹ چکا ہوتا یا وہ ایک طرف ہو کر چپکے سے بہہ رہا ہوتا جیسے وہ بھی ملک صاحب کی آمد سے سہم گیا ہو۔ گھوڑے کے بھاری سم دریا کی سفید ریت میں دھنس دھنس جاتے لیکن ملک صاحب کی ایڑی کے اشارے سے گھوڑا پوری قوت کے ساتھ ریت پر دوڑنے لگتا۔ دائیں بائیں شکاری کتے بھاگ رہے ہوتے' آگے ملازم شکار اٹھاتے اور ملک صاحب مشکی گھوڑے کی پیٹھ پر ہی سے رائفل کا نشانہ باندھتے اور دو چار پرندے گرا لیتے۔ ملک صاحب کا نشانہ جب کبھی خطا جاتا تو وہ یہ دلیل دیتے کہ ریت پر دوڑنے سے گھوڑا ہانپ رہا تھا اس لئے نشانہ خطا گیا' اور جب نشانہ ٹھیک لگ جاتا تو اس بات کا اعتراف نہ کرتے کہ ان کے ملازموں نے شکار کو پہلے ہی ادھ موا کرکے ان کے سامنے پھینک دیا تھا۔ ملک صاحب کے وفادار اور نمک خوار ملازم بھی ان کی کمزوریوں کو اچھی طرح جانتے تھے جو نہی ان کے فائر سے کوئی پرندہ زخمی یا بے جان ہو کر گر پڑتا تو وہ نہایت مبالغہ آمیز انداز میں اعلیٰ نشانہ بازی کی داد دیتے جس سن کو ملک صاحب پھولے نہ سماتے اور اگر نشانہ چوک جاتا تو گھوڑے کے اکھڑے ہوئے سانس یا پرندے کے فریب کو ذمہ دار ٹھہراتے اور کہتے "کتنا بد قسمت پرندہ تھا جو ملک صاحب کے فائر سے بچ کر در در کی ٹھوکریں کھانے کو رہ گیا ہے۔ ہائے بے چارہ پرندہ!"

شکار کھیلتے ہوئے بعض اوقات ملک صاحب گھوڑے سے اتر بھی جاتے لیکن اپنی جاہ و حشمت کی بلندیوں سے کبھی نیچے نہ آتے۔ وہ گھوڑا کسی ملازم کو تھماتے اور خود لمبے لمبے بوٹوں سمیت پیدل چلنے لگتے۔ اگر سورج تیز ہوتا تو پیشانی پر ٹوپی کا بڑھا ہوا حصہ کھینچ کر اور جھکا لیتے اور مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے آگے بڑھتے جاتے جب کہیں شکار نظر آتا' وہ جھٹ بندوق بردار ملازم سے بندوق لے کر فائر کرتے اور کتے اور ذاتی ملازم ایک دوسرے پر سبقت لینے کے لیے شکار کی طرف دوڑ پڑتے عموماً کتے ملازموں سے

آگے نکل جاتے۔ ملک صاحب کتوں کو شاباش دیتے اور ملازموں کو ایک آدھ گالی! گالی کھا کے ان کے اندر بھی ایک ابال آتا کیونکہ چلتے گھوڑے کو چابک مارا جائے تو اس کے نتھنوں سے غصہ اور سموں سے چنگاریاں نکلنے لگتی ہیں' لیکن یہ پسے ہوئے انسان تانگے کے گھوڑے سے بھی گئے گزرے تھے۔ ہر چیز پی جاتے' ہر بات سہہ جاتے! شکار میں کبھی خرگوش' کبھی تیتر اور کبھی بٹیر آجاتا۔ قسمت بہت ساتھ دیتی تو کبھی ایک آدھ ہرن کا بچہ مل جاتا' لیکن ملک صاحب اسی پر بہت اتراتے' اس میدان میں اپنے آپ کو یکہ و تنہا سمجھتے۔ ان کے مد مقابل تو تھا ہی کوئی نہیں' اور جس کے مقابلے میں کوئی نہ ہو وہ تو اپنے آپ کو شہنشاہ محسوس کرتا ہے! البتہ ملک صاحب اس بات پر بڑے زور و شور سے اظہار افسوس ضرور کرتے کہ وہاں شیر یا چیتا نہیں ہے ورنہ شکار کا مزہ تو ایسے درندوں کو مارنے میں آتا۔ شیروں اور چیتوں کا سامنا کرنا پڑتا تو پتہ نہیں ملک کا رویہ کیا ہوتا لیکن فی الحال تو وہ اپنے ملازموں پر اپنی بہادری کا رعب جماتے تھے اور معصوم جانوروں اور پرندوں پر اپنا غصہ نکالتے تھے۔ اگر جنگل میں کوئی جانور ہاتھ نہ آتا تو واپسی پر دریا کے کنارے دو چار مرغابیاں ہی مار گراتے جو نورا اور رحما بھاگ کر اٹھا لیتے۔ شروع شروع میں وہ مرغابیاں' خرگوش اور بٹیر وغیرہ ایک تھیلے میں ڈالتے جاتے تھے لیکن بعد میں ملک صاحب نے ہدایت کر دی تھی کہ انہیں ڈنڈے پر ڈال کر کسی نوکر کے کندھے سے لٹکایا جائے تاکہ آتے جاتے لوگوں کو پتہ چل سکے کہ شکار سے واپس آرہے ہیں' فاتحہ خوانی سے نہیں!

ملک صاحب مزارعوں سے زیادہ کتوں اور گھوڑوں کا خیال رکھتے تھے' انہوں نے ملازموں کے لیے کوارٹر بنوا رکھے تھے جن کی ملازم خود ہی مٹی سے لپائی کرتے' ان کی ٹپکتی چھتوں کو درست کرتے اور آگ یا پنکھے کے بغیر سردیوں اور گرمیوں میں گذر اوقات کرتے البتہ چھ شکاری کتوں اور چودہ گھوڑوں کے لیے انہوں نے بہت عمدہ رہائش گاہ بنوار رکھی تھی۔ کتوں کو تو وہ کھلا ہی چھوڑ دیتے تھے وہ جب چاہیں حویلی کے اندر اور باہر نکل جائیں البتہ گھوڑوں کی نقل و حرکت پر پابند تھی' وہ یا تو باہر زمینوں پر ہوتے

یا پھر اصطبل میں بند!
اصطبل ملک جابر علی کے والد صاحب کے زمانے کا تھا جب ان کے پاس صرف آٹھ گھوڑے ہوتے تھے۔ مزید چار گھوڑے تو عذرا کے جہیز میں آگئے تھے اور دو خود ملک صاحب نے خریدے تھے۔ عذرا بھی گھڑ سواری کی دلدادہ تھی لیکن جب سے زلفی کی پیدائش کے وقت اس کا اپریشن ہوا تھا' اس نے رائیڈنگ ترک کر دی تھی۔
ملک صاحب نے شہر سے ویٹرنری (VETERINARY) ڈاکٹر بلوایا اور گھوڑوں کی آسائشوں کے لیے نئی رہائش گاہ تعمیر کرنے کے بارے میں اس سے مشورہ کیا۔ اس نے کسی قسم کی تفصیلات میں گئے بغیر یہ کہہ دیا کہ اگر آپ موجودہ اصطبل کو ناکافی سمجھتے ہیں تو باہر کھلی ہوا میں شیڈ (SHED) بنوا لیجیے۔ ملک صاحب کو یہ عامیانہ سا مشورہ سخت ناپسند آیا اور انہوں نے کراچی میں ڈین اینڈ کو (DEEN • CO) نامی اسی ARCHITECT فرم کو ٹیلی گرام دے کر بلوایا جس نے ان کی والدہ ماجدہ کا مقبرہ ڈیزائن کیا تھا۔ مسٹر ڈین (اصلی نام عالم دین تھا) کو ملک صاحب کی پسند و ناپسند کا پتہ تھا اور وہ ملک صاحب کا زیادہ وقت ضائع کئے بغیر حسب منشا مشورہ دینے کی اہلیت رکھتا تھا۔
تیسرے دن مسٹر ڈین پہنچ گیا۔ ملک صاحب نے اسے حویلی اندر گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا' اس کی خوب خاطر مدارات کی اور اگلی صبح جب باقاعدہ پروگرام کے مطابق بزنس سیشن شروع ہوا تو ملک صاحب نے فرمایا۔
"آپ کو یاد ہو گا آپ نے میری مدر (MOTHER) کا مقبرہ ڈیزائن کیا تھا۔ وہ بہت اچھا تھا' آج تک لوگ اسے دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ آپ نے مقبرہ کو ایئر کنڈیشنڈ کرنے کی آفر بھی دی تھی لیکن میں نے سوچا کہ مردے کو ایئر کنڈیشنڈ کی کیا ضرورت ہے' وہ تو مٹی کا ڈھیر ہے۔ مٹی میں مل جائے گا' البتہ مجھے اعلیٰ نسل کے چودہ گھوڑوں کی بڑی فکر ہے۔ ان کی رہائش گاہ کی تعمیر ایک عرصے سے اوورڈیو (OVERDUE) ہے۔ ڈیڈی اپنے TASTE اور اس وقت کی REQUIREMENT کے مطابق ایک اصطبل بنوا گئے تھے جو موجودہ صورت حال میں بالکل ناکافی ہے۔"

"میں سمجھ گیا ملک صاحب! آپ فکر نہ کریں' کام بالکل آپ کی مرضی کے مطابق ہو گا۔ اگر کوئی خاص REQUIREMENT ہو تو بتا دیجئے۔"

"کوئی خاص REQUIREMENT نہیں' بس اس بات کا خیال رکھیئے کہ اصطبل رہائش گاہ ہو' قید خانہ نہ ہو اور ہاں گرمیوں میں تو ائیر کنڈیشننگ سے کام چل جائے گا' سردیوں کا کیا بندوبست کریں گے؟"

"میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ ایک ہی پلانٹ لگوایئے جسے سردیوں اور گرمیوں میں ضرورت کے مطابق ٹھنڈی اور گرم ہوا کے لیے سوئچ آن کیا جاسکے۔ اب تو یہ پلانٹ عام ملتے ہیں' امپورٹ کرنے کی بھی ضرورت نہیں' کراچی سے لیتا آؤں گا۔"

"ٹھیک ہے...... اور ہاں' فرش کی جگہ کیا ڈالیں گے HARD SURFACE پر گھوڑوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ وہ لیٹتے وقت خاصا UNCOMFORTABLE محسوس کرتے ہیں۔"

"عام طور پر تو لوگ پکے فلور پر PADDY وغیرہ ڈال دیتے ہیں......."

"دیکھئے مسٹر ڈین! اتنی بڑی فرم کے ریپ (REPRESENTATIVCE) ہو کر آپ نے کیا دقیانوسی بات کر دی......."

"آئی ایم سوری' ملک صاحب۔ میں صرف دوسرے عام لوگوں کی بات کر رہا تھا۔ میں آپ کے اصطبل کے لیے تو SUGGEST کر رہا تھا کہ امپورٹڈ ٹرف بچھا دیا جائے۔ یہ تو ماربل فلور سے بھی ECONOMICA رہے گا......."

"نہیں' ECONOMICAL یا UNECONOMICA ہونا UNDER CONSIDERATION نہیں' اصل چیز گھوڑوں کا آرام ہے' آپ اس کی بات کیجئے' بجٹ کو بھول جایئے۔ Money is no consideration"

"بس جی پھر میں تو امپورٹڈ ٹرف ہی کا مشورہ دوں گا اور گرین کلر SUGGEST کروں گا کیونکہ اس سے گھوڑوں کی آنکھوں کو طراوت کا احساس ہو گا......."

"That's good idea....... اچھا یہ بتایئے کہ اس سارے پروجیکٹ کو COMPLETE کرنے میں کتنا عرصہ لگے گا؟"

"تقریباً ایک سال۔"

"نو' نو' مسٹر ڈین Dont be so Cruel to my Horses اب جنوری ختم ہونے والا ہے۔ میں آئندہ گرمیوں سے پہلے پہلے یہ پروجیکٹ مکمل دیکھنا چاہتا ہوں۔ ہر لحاظ سے!"

"ملک صاحب' ذرا مشکل ہو جائے گا ہمارے لئے چار پانچ اور پروجیکٹ بہت ارجنٹ ہیں ہمارے پاس ایک ہسپتال کا منصوبہ ہے' ایک ہوم اکنامکس کے کالج کی تعمیر ہے اور ایک انڈسٹریل کمپلکس کی EXPANSION ہے۔"

"گھوڑوں کے اصطبل سے کوئی پروجیکٹ زیادہ اہم نہیں' آپ پہلے اسے سنبھال لیجئے۔ ضرورت کے مطابق زیادہ مین پاور لگائیے۔ ائیر کنڈیشننگ پلانٹ پہلے خرید لیجئے' اور اگر ضروری سمجھیں تو ساری پیمنٹ (PAYMENT) آج لے جائیے۔

But I want this project to be complete in all respects by 30 june at the latest.

"ٹھیک ہے ملک صاحب' ایسا ہی ہو گا۔ ہم آپ جیسی پارٹی کو ناراض بھی تو نہیں کر سکتے!"

"او۔کے' تھینک یو!"

تھینک یو۔"

مسٹر ڈین ایک ہفتے بعد اپنے ایک آدمی کے ہاتھ نئے اصطبل کے رف سکیچ بھجوادیئے جو ملک صاحب نے معمولی ردو بدل کے ساتھ منظور کردیئے۔ اگلے ہفتے تفصیلی ڈیزائن پہنچ گئے اور مسٹر ڈین اور ملک صاحب کی پہلی ملاقات کے تین ہفتوں بعد اصطبل کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ اور ۳۰ جون سے پہلے پہلے ملک صاحب کی مرضی کے مطابق سارا پروجیکٹ مکمل ہو گیا ۳۰ جون کو چودہ گھوڑے اپنی نئی ائیر کنڈیشنڈ رہائش گاہ میں منتقل ہو گئے۔

گلابا اب بھی بھیڑ بکریاں پال کر گذارہ کرتا تھا لیکن ان سردیوں میں جانوروں کی ایک عجیب بیماری پھیل گئی۔ چھوٹے چھوٹے سفید کیڑے (بالکل سفید جوؤں کی طرح) بھیڑوں اور بکریوں کے بالوں میں گھس کر ان کی جلد سے چمٹ گئے۔ پہلے تو بکریاں کبھی کھروں

سے اور کبھی دانتوں سے کھجلی کرتی رہیں لیکن رفتہ رفتہ بیمار پڑنے لگیں۔ گلابے نے بھیڑوں کو بیماری سے بچانے کے لیے سردیوں ہی میں مونڈ ڈالا' بکریوں کو گرم پانی سے نہلایا' پانی میں نمک ملا کر اور ہاتھوں سے مل مل کر ان کی جلد کو رگڑا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ پہلے ایک آدھ بکری فوت ہونے لگی اور پھر دن میں چار چار پانچ پانچ گلابے نے اونے پونے داموں اپنے ریوڑ کو بیچنا چاہا لیکن بیماری کا سن کر کوئی شخص بھیڑ کا بچہ بھی خریدنے کو تیار نہ تھا۔ بعض لوگوں نے گلابے کو مشورہ دیا کہ وہ شہر جا کر ڈنگر ڈاکٹر بلوالائے۔ وہ شہر گیا بھی لیکن پہلے تو چار پانچ دن ڈنگر ڈاکٹر ہی نہ ملا اور خدا خدا کر کے جب وہ ہاتھ آیا تو اس نے گلابے کا غریبانہ چہرہ دیکھ کر کہہ دیا "بابا! یہیں لے آ اپنی بکریوں کو' ہمارے لئے کام چھوڑ کر جانا مشکل ہے۔" اب گلابا چالیس میل دور اپنے بیمار ریوڑ کو لے کر کیسے جاتا! بہت سی بھیڑیں اور بکریاں تو چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گئی تھی۔ جو آج صحت مند لگتی تھی کل بیمار پڑ جاتی تھی' اور جو آج بیمار پڑتی تھی وہ کل مرجاتی تھی۔

گلابا بالکل بے بس ہو کر اپنا سارا کنبہ اجڑتے دیکھتا رہ گیا۔ ہفتے دس دن کے اندر اندر اس کا باڑہ خالی رہ گیا...... اب صرف گلابا' اس کا وفادار کتا اور پنجرے میں بند طوطا رہ گیا۔ چالیس نفوس میں سے صرف تین!

گلابے نے اس صدمے کا بہت گہرا اثر لیا۔ وہ اب مستقلاً چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ پہلے بھی کوئی ہٹا کٹا گھبرو نہیں تھا۔ سردیوں اور گرمیوں میں بکریاں چرا چرا کر بالکل گھس چکا تھا۔ اس کا سانولا چہرہ سیاہ ہو چکا تھا اور سر کے پتلے بال بالکل جھڑ چکے تھے جس کی وجہ سے اس کی کالی کھوپڑی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ سامنے کے دو دانت بھی گر چکے تھے جن کے جن کے کھوڑ' خالی تھے۔ اس کے کالے ہونٹوں پر عموماً پپڑی جمی رہتی اور وہ کبھی ہائے چنبی' ہائے چنبی کہہ کر اپنی پسندیدہ بکری کو یاد کرتا اور کبھی ڈبو' ڈبو کہہ کر کتے کو آواز دیتا اور کبھی طوطے سے اس کی قید اور بھوک کے لیے

معافی مانگتا۔
طوطا تو پھر قیدی تھا لیکن ڈبو آزاد ہونے کے باوجود کسی کے در پر رزق مانگنے نہ جاتا۔
شائد اس نے اپنے باوقار آقا کی عزت کی خاطر یہ رویہ اختیار کر رکھا تھا' ایک دن گلابے کا پرانا ساتھی گاما اس کا پتہ کرنے آیا تو گلابے نے کہا۔ "یار گامے' جاتے جاتے اس معصوم قیدی کو تو رہا کرتا جا۔"
گامے نے پنجرے کا دروازہ کھولا اندر ہاتھ ڈال کر طوطے کو نکالا اور باہر صحن میں اڑا دیا۔
گامے کے جانے کے بعد طوطا پر پھڑ پھڑاتا ہوا دوبارہ پنجرے میں داخل ہو گیا۔ ڈبو کتے نے گلابے کا آخری وقت ساتھ چھوڑا نہ گنجے طوطے نے' البتہ گاؤں والوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ بھلا اس سے کسی کو کیا سرو کار تھا' نہ خاندان نہ برادری' نہ اثر نہ رسوخ! "جانے دو' مرنے دوا سے" والا رویہ غالب تھا۔
چند دنوں بعد گلابا' ڈبو اور طوطے کو تنہا چھوڑ کر دنیا سے چل بسا۔
لاوارث گلابے کی تجہیز و تکفین کا مسئلہ اٹھا' تو گاؤں والے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ اگرچہ متوقع خرچے کی رقم کچھ زیادہ نہ تھی' لیکن گاؤں کا کوئی شخص اتنی تھوڑی سی رقم بھی خرچ کرنے کو تیار نہ تھا۔ پتہ نہیں گاؤں کے کسی آدمی نے حویلی کے نوکروں کے ذریعے ملک صاحب تک یہ بات پہنچا دی یا ملک صاحب کو اپنے ذرائع سے پتہ چل گیا کہ گلابے کی میت بے گور و کفن پڑی ہے۔ انہوں نے فوراً اپنا منشی بھیجا جس نے ملک صاحب کے حکم کے مطابق کفن دفن کا سارا انتظام خود کیا۔ بلکہ جاتے جاتے سب کے سامنے گاؤں کے مستری شریف کو بارہ سو روپے بھی دے گیا کہ وہ سو روپے کی اینٹیں خرید کر گلابے کی قبر پر لگا دینا باقی ایک ہزار روپے سے قبرستان کی چار دیواری کھڑی کر دینا' کیونکہ ملک صاحب کا یہی حکم ہے۔

- حصہ دوم

"ملک جابر علی جیسا جاہل اور نا عاقبت اندیش شخص نہیں دیکھا۔ ان کی نالائقی سے جب گاؤں میں قحط پڑا تو اس سے اگلے سال اسی مہینے میں ان کا چہیتا بیٹا زلفی یورپین اکیڈمی سے امپالا کار میں آتا ہوا ایکسیڈنٹ میں مر گیا۔ پہاڑی علاقے میں کار پھسل کر گہرے کھڈ میں گر گئی' کار بھی چکنا چور ہو گئی اور معصوم بچہ اور ڈرائیور فتح علی' دونوں موقع پر ہلاک ہوگئے۔ ملک صاحب اسے ڈرائیور کی غلطی سمجھتے رہے اور اسی کو کوستے رہے لیکن ان کی کھوپڑی میں ہرگز یہ بات نہ آسکی کہ حادثے کے ذمہ دار وہ خود ہیں کیونکہ ان کے اپنے کرتوتوں کا خمیازہ ان کی اولاد کو بھگتنا پڑا۔ گھر میں پہلے ہی پولیو کا مارا اپاہج بیٹا بیکار پڑا ہے جو پھندنے والی ٹوپی والے منشی لال دین کے کھاتوں سے جی بہلا رہا ہے۔ اگر ملک صاحب میں کچھ خوف خدا ہوتا تو یقیناً سمجھ جاتے کہ شعیب کی جسمانی معذوری کے ذمہ دار بھی وہ خود ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یہ لڑکا ذکیہ کے پیٹ میں تھا اور سیلاب آیا تھا۔ ملک صاحب نے اپنے باغوں اور فصلوں کو بچانے کے لئے اس کا رخ گاؤں کی طرف موڑ دیا تھا جس سے گاؤں کا مشرقی حصہ بالکل تباہ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ان کے ہاں جو لڑکا پیدا ہوا' دو سال کی عمر میں پولیو کا شکار گیا۔ وہ نہ اس وقت سمجھے اور نہ زلفی کی موت پر انہیں ہوش آیا۔ یہ دو جمع دو کرنے والے حسابی کتابی لوگ کیا جانیں قدرت کے کھیل! بڑے بنے پھرتے ہیں عاقل و دانا! ان کی پھوں پھاں دیکھو اور ان کی عقل دیکھو۔ اونہہ' جاہل اور نالائق کہیں کے!"

"حد ہوتی ہے غرور و تکبر کی۔ اس کے نالائق اور نشہ کرنے والے بیٹے ضمیر نے گاؤں سے شہر جاتے ہوئے اپنی سرخ فوکسی سڑک کے کنارے کسی درخت سے ٹکرا دی تو منہ زور بیٹے کو کچھ کہنے جرات نہ ہوئی' البتہ غصے میں آکر سارے درخت کٹوا دیے۔ کتنی محنت سے لگوائے گئے تھے یہ درخت اور کتنے برسوں کے بعد یہ اس قابل ہوئے

تھے کہ پیدل چلنے والوں کو چھاؤں دے سکیں! ملک صاحب نے تو ہمارے سروں سے چھاؤں بھی چھین لی۔ بھلا جن سڑکوں پر درخت نہ ہوں' جس بستی سے شام کے وقت چولہوں کا دھواں نہ اٹھے' جہاں صبح سویرے چڑیاں نہ چہچہائیں وہ کوئی گاؤں ہوتا ہے' اسے تو قبرستان کہنا چاہیے' قبرستان!"

"پچھلے دنوں بابا میراں بخش کا بیٹا فرمان علی جب چھٹی پر آیا ہوا تھا تو یونہی پرانی یادیں تازہ کرنے کے لئے حویلی کی طرف نکل گیا۔ بعد میں ملک صاحب نے میراں بخش کو حویلی میں بلوا کر ڈانٹ دیا کہ وہ اپنے بیٹے کو لگام ڈال کر رکھے' وہ مزارعوں کی بیویوں اور بیٹیوں کو تاڑتا پھرتا ہے۔ وہ تو میراں بخش تھا جو سب کچھ سن کر واپس آگیا' اگر میں ہوتا تو میں اسے منہ پر سناتا کہ شریف زادوں پر الزام لگانے سے پہلے اپنی حویلی کی خبر لو۔ ذکیہ بوڑھی ہو گئی ہے تو اب شہر والا ڈاکٹر عذرا کے گرد ہو گیا ہے۔ گرمیوں میں ساری ساری دوپہر' ٹھنڈے کمرے میں' وہ عذرا کی نبضیں ٹٹولتا رہتا ہے۔ شرابی ضمیر نے شہر میں عیاشی کا اڈہ کھول رکھا ہے۔ یہ سارا کنجر خانہ ہے' کنجر خانہ! آئے بڑے خاندانی لوگ' عزت دار! عزت اور غیرت کے کچھ نشان باقی ہیں تو ہم غریبوں میں ہیں۔ ورنہ ان امیر زادوں کا تو اخلاقی دیوالیہ نکل چکا ہے۔"

"وہ امیر ہونگے تو اپنے گھر اور ہم غریب ہیں تو اپنے گھر۔ محنت مزدوری کرتے ہیں' دنیا بھر کے دھکے کھاتے ہیں' ہمیں وہ دیتے کیاہیں؟ الٹا ہم سے لیتے ہیں۔ یہ ہمارے بھائی ہیں جو ان کی زمینوں اور فیکٹریوں میں کام کرتے ہیں' وہ ہم سے مل جائیں تو ہم ان کی حویلی...... دولت اور غلاظت کے گڑھ...... کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں۔ بڑا گھمنڈ ہے انہیں اپنے چار بیٹوں پر۔ وہ نہیں جانتے کہ ان میں سے ایک معذور ہے تو دوسرا مغرور' بس لے دے کے دو بڑے لڑکے رہ جاتے ہیں پرویز اور قدیر۔ ان سے بھی نپٹ لیں گے ہم وقت آنے پر۔ رائفلیں' پستول اور بندوقیں کیا کر لیں گی ہمارا! اب ہم بھی ایسے نہتے نہیں ہیں' ہم بھی دو چار کو مار کر ہی مریں گے۔ اگر ان کے ہتھیار غالب آ بھی گئے تو یہ ان کی وقتی فتح ہو گی۔ انہیں یہ جان لینا چاہیے کہ معصوم

خون کا ایک قطرہ سینکڑوں ہتھیاروں پر بھاری ہوتا ہے۔"

یہ گفتگو سن کر میں حیران رہ گیا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی گاؤں ہے جہاں دس پندرہ سال پہلے لوگ ملک جابر علی خان کے نام سے کانپ اٹھتے تھے' حویلی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے' گاؤں کے لڑکے' عورتیں' مرد' جوان اور بوڑھے گاؤں کے مشرق کی طرف رفع حاجت کے لئے نہیں نکلتے تھے کہ کہیں جھاڑ نہ پڑ جائے یا پٹائی نہ ہو جائے۔ ان کا رخ گاؤں کے مغربی جانب رہتا تھا جہاں ویرانی تھی' غربت ہی غربت! سوچنے کی بات یہ تھی کہ دس پندرہ برسوں میں ساری کایا کیسے پلٹ گئی۔ یہ کیا ہوا چل گئی؟ یہاں کہیں کمیونسٹ تو سرگرم عمل نہیں رہے؟ کہیں اشتراکی لٹریچر تو نہیں پھیلایا گیا؟ کہیں مملکت خدا داد کی نظریاتی بنیادیں تو کھوکھلی نہیں کر دی گئیں؟ لوگوں کے دلوں میں کہیں اسلام کی محبت تو کم نہیں ہو گئی؟ کہیں لوگ نظریاتی طور پر منحرف تو نہیں ہو گئے؟ کہیں امام مسجد اور خطیب نے تبلیغ کا کام تو ترک نہیں کر دیا؟ کہیں کوئی غیر ملکی ایجنٹ تو یہ سب کچھ نہیں کروا رہے؟

دراصل چودہ پندرہ برسوں میں شانتی نگر کی اکثر مرد آبادی اپنا گاؤں چھوڑ کر غیر ممالک میں تلاش معاش کے لئے نکل گئی تھی۔ ان میں سے بہت سے لوگ دوبئی' کویت' سعودی عرب حتی کہ لندن اور امریکہ تک پہنچ چکے تھے۔ شاید ہی کوئی گھرانا ایسا ہو جس کا بیٹا' پوتا یا داماد ریال' پونڈ یا ڈالر نہ کما رہا ہو۔

صدیوں کی قلت کے بعد اچانک دولت کی افراوانی ہوئی تو سارا نقشہ ہی بدل گیا۔ اب اکثر کچے گھروندے پکے مکانوں میں بدل گئے۔ بیشتر گھروں میں ریڈیو ٹرانسسٹر' کیسٹ پلیئر اور رنگین ٹیلی ویژن آگئے۔ بعض گھروں میں وی سی آر اور ڈیپ فریزر بھی موجود تھے۔ اگرچہ گاؤں میں ابھی ٹیلیفون کی سہولت نہیں تھی لیکن کئی شوقین حضرات کارڈ لیس (CORDLESS) ٹیلیفون لے آئے تھے جنہیں انہوں نے فی الحال ڈرائنگ روم میں سجا رکھا تھا۔

حکومت نے بھی پچھلے پندرہ برسوں میں ملک کے دوسرے حصوں کی طرح شانتی نگر کی

ترقی پر بہت توجہ دی تھی۔ سب سے پہلے یہاں سڑک اور بجلی پہنچائی گئی' پھر لڑکوں کے لیے انٹر کالج اور لڑکیوں کے ہائی سکول بنا۔ بیس بستروں والا رورل ہیلتھ سنٹر قائم ہوا جس میں ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر اور ایک لیڈی ڈاکٹر تعینات ہوئی۔ اس کے علاوہ لڑکیوں کے لیے ٹیکنیکل سکول اور عوام کی سہولت کے لئے پبلک کال آفس موجود تھا۔ اب وہ پبلک کال آفس کی جگہ ٹیلیفون ایکسچینج لگوانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کامو نے تو اپنے حصے کی زمین لڑکیوں کے کالج کے لئے وقف کر رکھی تھی جبکہ شیدے نے پوری مسجد میں بجلی کے پنکھے لگوا دیئے تھے۔

اس ملکی ترقی اور غیر ملکی دولت کے ساتھ جو سب سے انقلابی چیز شانتی نگر میں داخل ہوئی' وہ شعور تھا...... سماجی شعور' اقتصادی شعور' تعلیمی شعور اور سیاسی شعور! اس شعور نے وہاں بجلی سے زیادہ چکا چوند پیدا کر رکھی تھی اور جدید سہولتوں نے گاؤں والوں کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ اب گاؤں کا کوئی فرد ملک جابر علی خان جیسے لوگوں کی برتری تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔ گاؤں والوں کے دل سے ہر قسم کا خوف نکل چکا تھا' اب وہ اپنی عزت نفس سے اچھی طرح آشنا ہو چکے تھے۔ اب وہ ہر کسی کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر مساوی سطح سے بات کرنے کا عزم رکھتے تھے بلکہ ذہنی لگام اترنے سے بعض تو اتنے بے لگام ہو گئے تھے کہ وہ اپنی دیرینہ پس ماندگی' سابقہ زیادتیوں اور پرانے استحصال کا بدلہ چکانے کے درپے تھے۔

شیکو اب ایک با عزت مکان میں رہتا تھا جو سارے کا سارا پکی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ پیچھے دو بڑے کمرے تھے جنہیں بیڈ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا' آگے کھلا برآمدہ تھا جس کے پکے فرش پر کسی کاریگر مستری سے پلستر کرتے وقت بیل بوٹے بنا دیئے تھے۔ برآمدے کے دونوں کناروں پر دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے' ایک کمرہ سٹور کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور دوسرا خراب موسم میں باورچی خانے کے طور پر اچھے موسم میں کھانا پکانے کے لئے برآمدے کے ساتھ صحن کی طرف ایک کونہ مخصوص تھا جس

کے ارد گرد دو اڑھائی فٹ دیوار کھڑی کر دی گئی تھی۔
جب میں شیکو سے ملنے اس کے گھر گیا تو وہ صحن میں اپنا موٹر سائیکل کھول کر اس کے پلگ (PLUG) وغیرہ صاف کر رہا تھا۔ اس نے موٹر سائیکل کو پہلو کے بل الٹا رکھا تھا اور ایک کھلے منہ کے برتن میں مٹی کا تیل ڈال کر اس میں پلگ دھو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک گندہ کپڑا اور ناک پر میلے ہاتھ سے کالک کا نشان لگ گیا تھا۔
میں پرانی عادت کے مطابق دروازہ کھٹکھٹائے بغیر' سیدھا صحن میں چلا گیا تو شیکو مجھے دیکھ کر خوشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ چھاتی سے چھاتی ملائی لیکن بازو پھیلائے رکھے تاکہ اس کے گندے ہاتھ میرے کپڑوں کو خراب نہ کریں البتہ میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے خوب بھینچا اور فرط مسرت میں اسے بازوؤں میں جکڑ کر زمین سے اٹھا لیا۔ اس نے دوستانہ احتجاج کرے ہوئے کہا "روک یار' ذرا روک' میرا تہبند کھل گیا ہے۔" میں نے دوبارہ اسے زمین پر پاؤں رکھنے دیئے تو وہ کہنیوں سے اپنا تہبند سنبھالتا ہوا نلکے کے پاس گیا' جلدی جلدی صابن سے ہاتھ دھوئے' از سر نو تہبند باندھا اور میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے صحن کے آخری سرے پر بنی ہوئی بیٹھک میں لے گیا۔ شاید وہ مجھے دکھانا چاہتا تھا کہ اب وہ دو کوٹھڑیوں والے کچے کوٹھے میں نہیں رہتا بلکہ اب اس کا پکا مکان ہے جس میں دوسری ضرورتوں کے علاوہ ایک بیٹھک بھی ہے' اور بیٹھک میں صوفہ سیٹ اور کرسیاں بھی ہیں۔ ایک طرف شہری وضع کا ایک پلنگ بچھا تھا جس پر رات کی رات مہمان کو سلایا بھی جا سکتا تھا۔
شیکو نے مجھے بڑے اصرار سے پلنگ کی بجائے صوفے پر بٹھایا' اندر چائے پانی بھجوانے کی ہدایت کی اور ہم بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ اس نے جیب سے پلیئرز سگریٹ کی ڈبیا نکالی' مجھے سگریٹ پیش کیا۔ میرے انکار پر اس نے جملہ کسا کہ شہر جا کر بھی مولوی کے مولوی ہی رہے۔ اب ایک کسر ڈاڑھی کی رہ گئی ہے' وہ بھی رکھ لو۔
میں نے کہا ڈاڑھی ہے تو سہی لیکن نظر نہیں آتی۔ وہ میری بات نہ سمجھ سکا اور خود سگریٹ سلگا کر میری باتیں سننے لگا۔

ماضی کی یادیں دہراتے ہوئے اس نے کہا۔
"تمہیں بچپن کا واقعہ یاد ہے؟"
"کونسا؟"
"یہی تو ظلم ہے کہ جب انسان بڑا آدمی بن جاتا ہے تو پرانی باتیں بھول جاتا ہے' حالانکہ

اس وقت تم نے کہا تھا کہ میں یہ واقعہ ساری عمر نہیں بھولوں گا۔"
"بھئی بتاؤ تو سہی کس واقعہ کا ذکر کر رہے ہو۔"
"وہی جب میں' تم اور قادرا (غلام قادر) سکول سے واپسی پر گاؤں کے تالاب میں کاغذ کی کشتیاں بنا بنا کر ڈال رہے تھے......."
"اور تم نے اپنی کشتی کو آگے بڑھانے کے لئے پانی میں پتھر پھینکا تھا اور وہ آگے بڑھنے کی بجائے وہیں ہچکولے کھا کر الٹ گئی تھی!"
"ہاں' ہاں اور اس کے بعد ملک جابر علی خان کے نوکر احمد خان نے تقریباً ہمارے منڈے ہوئے سروں میں ایک ایک ڈنڈا برسا دیا تھا......"
"بالکل' بالکل تمہارے اور قادرے کے سر پر اچھا خاصا گومڑ ہو گیا تھا......"
"ہاں' میں وہی واقعہ تمہیں یاد دلانا چاہتا تھا۔"
"کیوں؟"
"کیوں کہ اب حالات بدل گئے ہیں۔ سارا گاؤں جاگ اٹھا ہے' میرا بھی جی چاہتا ہے کہ اب ہم تینوں' میں تم اور قادرا...... حویلی میں جا کر ملک صاحب کے سر پر تین ڈنڈے مع سود برسا آئیں تاکہ وہ مہینوں گومڑ سہلاتا رہے۔"
"نہیں یار' چھوڑو' معمولی بات ہے' بھول جاؤ!"
دراصل بھولا تو میں بھی نہیں تھا اس وقت قادرے اور شیکو کے سروں پر گومڑ ہوئے تھے تو میرے دل پر لیکن میں نے شیکو کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اسے بھول جانے کا مشورہ دیا اور موضوع بدلنے کے لیے اس کے حالات زندگی پوچھنے لگا ورنہ وہ تو ابھی ملک صاحب سے حساب چکانے کے درپے تھا۔

اس نے بتایا کہ اس نے پہلے پہل فوج میں نوکری شروع کی جہاں وہ ڈرائیور بنا' دس سال بعد ریلیز پر گھر آیا تو بل ڈوزر کا ڈرائیور بن گیا۔

نہری علاقے میں سیم کی نکاسی کے لئے بڑے بڑے کھال کھودے جا رہے تھے' وہاں فی گھنٹہ کے حساب سے بل ڈوزر چلانے لگا۔ پھر گاؤں والے باہر جانے لگے تو دیکھا دیکھی وہ بھی باہر چلا گیا۔ پہلے مسقط گیا' قادرا دوبئی میں رہا...... "یہ ساری کمائی دوبئی کی ہے" اس نے بتایا اور کہا "اب بھی چھ مہینے لگا آتا ہوں اور سال بھر کا راشن کما لاتا ہوں۔ ایک بیوی' دو بچے اور ایک بوڑھی ماں' اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بڑا اچھا گذارا ہو رہا ہے لیکن جب بھی حویلی کی طرف دیکھتا ہو تو گومڑ یاد آجاتا ہے جو کینسر کے پھوڑے کی طرح میرے اندر پل رہا ہے۔ چل یار' کسی دن ملک صاحب کا یہ ادھار چکا ہی آئیں!"

میں نے اسے صبر کی تلقین کی اور چلا آیا۔

شانتی نگر کا گاؤں انگڑائی لے کر جتنا جوان ہو گیا تھا' ملک جابر علی اتنے ہی بوڑھے ہو گئے تھے۔ ان کے چہرے پر جھریوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ گال لٹک چکے تھے اور ٹھوڑی کے نیچے ایک اور ٹھوڑی نکل آئی تھی۔ عمر کے علاوہ ذکیہ کی طویل علالت اور زلفی کی اچانک موت نے انہیں خاصا مضمحل کر دیا تھا۔ اب انہیں خود ہائی بلڈ پریشر اور ہائپر ٹینشن (HYPER TENSION) کی شکایت رہتی تھی۔ انہوں نے شوقیہ گھڑ سواری اور شکار کھیلنا بھی ترک کر دیا تھا البتہ ایک حلیم اور تابع گھوڑی پر بیٹھ کر اب بھی وہ مربعوں کی نگرانی کر آتے تھے۔ ان کے لباس میں بھی خاصی تبدیلی آگئی تھی۔ اب وہ تنگ برجس اور جیکٹ کسنے کی بجائے شلوار قمیض پہنتے تھے اور سردیوں میں اس پر چیک کوٹ کا اضافہ کر لیتے تھے جس کی کہنیوں پر براؤن رنگ کا چمڑا لگا ہوا تھا۔ کھلے گلے کو سردی سے بچانے کے لیے کبھی ٹائی لگا لیتے تھے اور کبھی مفلر باندھ لیتے تھے۔ ان کی مونچھیں' بھوں اور سر کے بال بالکل سفید ہو چکے تھے جو گورے چہرے پر بھلے

لگتے تھے۔

اس جسمانی کمزوری کے باوجود اس کے رعب' دبدبے اور اختیارات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ انہوں نے نہ صرف زمینوں اور کارخانوں کا سارا حساب اپنے پاس رکھا ہوا تھا بلکہ تمام چھوٹے موٹے فیصلے بھی خود ہی کرتے تھے۔ کئی دفعہ پرویز اور قدیر نے نہایت مودب طریقے سے مشورہ دیا کہ اب آپ آرام فرمائیں' ہم سب کچھ سنبھال لیں گے لیکن وہ نہ مانے۔ ملک صاحب کا فلسفہ یہ تھا کہ ریٹائر منٹ کا مطلب ہار مان لینا اور موت کو دعوت دینا ہے کہ اب تم آجاؤ' میں فارغ بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ وہ اکثر کہتے "میں آخر دم تک ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ جب تک میرے دم میں دم ہے' حویلی کے تمام امور نپٹاؤں گا۔ تم مجھے مشورہ دے سکتے ہو لیکن فیصلہ نہیں کر سکتے۔ فیصلے کا حق مجھے اور صرف مجھے ہے۔" ایک دفعہ قدیر نے جو پرویز کی نسبت زیادہ باتونی اور جرات مند تھا' عرض کیا کہ اب ہماری عمر بھی چالیس پینتالیس سال کی ہو چکی ہے' اب ہم بچے نہیں ہیں' ہم نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ آپ ہمیں موقع تو دیجئے! ہم میں اتنی سوجھ بوجھ ہے کہ آپ کی طرح نہیں تو کم از کم اس معیار کے لگ بھگ حویلی کا کاروبار چلا سکیں لیکن ملک صاحب نے ایک نہ مانی۔ انہوں نے سارا کنٹرول اپنے پاس رکھا...... مال کی خرید و فروخت سے لے کر آمدنی اور اخراجات کی جزئیات تک!

اس رویے سے پرویز اور قدیر بالخصوص اور شعیب اور ضمیر بالعموم بہت دل برداشتہ محسوس کرتے تھے۔ انہوں نے ایک دو مرتبہ گلہ بھی کیا کہ کیا یہ حویلی صرف ملک صاحب کی ہے' اس میں ہمارا کوئی اختیار نہیں لیکن ملک صاحب کے غصے اور بزرگی کے پیش نظر اس گلے کو مطالبے کی شکل نہیں دیتے تھے اور خاموشی سے سب کچھ برداشت کئے جاتے تھے۔

شانتی نگر کا ایک پرانا باسی بابا کلو اپنے خاندان سمیت گاؤں میں باہر ایک نئے اور کشادہ

مکان میں منتقل ہو گیا تھا کیونکہ اس کا گھر داماد بوٹا خان بھی باہر جا چکا تھا اور وہ ہر دوسرے تیسرے مہینے وہاں سے ڈرافٹ بھیج دیتا تھا' میں نے کلو کے نئے مکان کا بیرونی دروازہ کھٹکھٹایا تو کلو ہی نے دروازہ کھولا۔ وہ ابھی ابھی ظہر کی نماز پڑھ کر آیا تھا' اس کی سفید نورانی ڈاڑھی بڑی پاکیزہ لگ رہی تھی۔ ڈاڑھی سے چہرے کا جو حصہ ننگا رہ گیا تھا' وہ حسب معمول کالا تھا لیکن اس کے کالے پن کی شدت میں کچھ کمی آگئی تھی' شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اب کئی برسوں سے اس نے کڑکتی دھوپ میں ہل نہیں چلایا تھا بلکہ اپنا زیادہ تر وقت کمرے کے اندر پنکھے کے نیچے گذارتا تھا اور باقاعدہ نماز کی وجہ سے دن میں پانچ دفعہ منہ دھوتا تھا۔ اب بھی اس کا لباس تہبند اور کرتہ ہی تھا لیکن یہ دونوں کپڑے سفید اور صاف ستھرے تھے۔ اس کی پگڑی بھی سفید ہی تھی جو اس نے کلف لگائے بغیر سر پر معزز لوگوں کی طرح لپیٹ رکھی تھی۔ پاؤں میں البتہ دیہاتی جوتی کی جگہ براؤن رنگ کی مکیشن تھی جسے پالش کئے کئی دن ہو چکے تھے۔

بابا کلو مجھے گھر کے اندرونی حصے میں لے جانے کی بجائے سیدھا ڈرائنگ روم میں لے گیا جہاں بغیر بازو والا ایک صوفہ سیٹ رکھا تھا جس کی پشت پر سکینہ نے کروشئے سے کاڑھے ہوئے پھولوں والا کپڑا چڑھا رکھا تھا اور ہر سیٹ پر روئی سے بھرا ہوا کشن رکھا تھا۔ صوفے کے علاوہ وہاں چھ آرام کرسیاں تھیں جن کی گدیاں سکینہ کی سلیقہ شعاری کی گواہی دے رہی تھیں۔ کرسیوں کے سامنے ایک میز تھی جس پر شیشے کی دو ایش ٹرے دھری تھیں۔ سامنے کارنس پر لمبی گردن والے خالی گلدان اور ان کے درمیان بوٹا خان کی رنگین تصویر سجی تھی جو اس نے باہر سے کھنچوا کر بھیجی تھی۔ اس تصویر میں اس نے کوٹ پتلون اور شوخ سرخ رنگ کی ٹائی پہن رکھی تھی۔

کارنس کے دونوں جانب' دیوار میں ایک ایک الماری بنی ہوئی تھی جن میں لکڑی کے پھٹوں پر پرانے اخبار پھیلا کر ان پر شیشے کے گلاس اور چائے کی پیالیاں سجا رکھی تھیں۔ جگ

اور ٹی سیٹ وغیرہ شاید اندر تھے۔

بابا کلو نے مجھے صوفے پر بٹھا کر خود ایک کرسی سنبھال لی۔ اس کے بیٹھنے سے اس کا تہبند اتنا اوپر سرک گیا کہ اس کی سیاہ پنڈلی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا کہ شاید اب بھی ناخن رگڑنے سے اس کی سیاہ جلد پر سفید لکیریں ابھری ہوئی ہوں لیکن ایسا نہ تھا۔ بابا کلو کے چہرے کی طرح اس کی پنڈلیاں بھی کالی مگر صاف تھیں۔

میں نے ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے کے بعد بابا کلو سے ماسی پھلاں' بن سکینہ' بوٹا اور رحم علی کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا کہ بوٹا تو باہر ہی ہوتا ہے' کبھی دو سال یا تین سال کے بعد آتا ہے لیکن پیسے باقاعدگی سے بھیجتا رہا ہے' آج کل ہالینڈ میں ہوتا ہے' کسی فیکٹری میں ملازم ہے اچھے پیسے کما رہا تھا۔ اب تو اس نے وہاں اپنا مکان بھی خرید لیا ہے کہہ رہا تھا کہ سکینہ کو بھی بلوا لوں گا لیکن میں نے منع کر دیا ہے۔ سکینہ اور اس کے بچے چلے گئے تو مجھ جیسے بڈھے کا کیا ہوگا!

میں نے کہا "ماسی پھلاں تو ہے!"

"کہاں ہے ماسی پھلاں' اسے مرے ہوئے تو خاصا عرصہ ہو گیا۔ اگلی فصل کٹنے پر تین سال پورے ہو جائیں گے۔ بوٹا پچھلی دفعہ اس کی بیماری کا سن کر آیا تھا' اس کا فیصلہ ہونے تک یہیں رہا۔ تار دیکر پندرہ دن کی چھٹی اور لے لی تھی۔ بڑا اچھا لڑکا ہے' اپنے ہاتھوں سے اپنی ساس کو دفنایا۔ سارا خرچ خود کیا اور کہہ رہا تھا کہ اگلی دفعہ آیا تو ماسی کی قبر پکی کرواؤں گا اور شہر سے سفید پتھر پر اس کا نام بھی لکھوا کر لاؤں گا۔ چلو اسی طرح ہمارا بھی کچھ نام رہ جائے گا ورنہ ہمارا تو نام و نشان نہ زندوں میں ہوتا ہے اور نہ مردوں میں۔"

"آپ اتنے مایوس کیوں ہیں چچا جان؟ آپ کا نام و نشان رحم علی جو ہے۔ میں نے سنا ہے کالج میں پڑھتا ہے۔"

"ہاں' بوٹا خان نے ضد میں آکر اسے کچھ زیادہ ہی پڑھوا دیا ہے۔ ہم سمجھتے تھے چھ سات

جماعتیں کافی ہوتی ہیں' یہ سارے لڑکے جو آج کل ڈالر اور ریال کما رہے ہیں' کوئی بی اے' ایم اے پاس تھوڑے ہی ہیں' یہی دو دو' چار چار جماعتیں پڑھے ہوئے ہیں۔ میں نے تو بوٹا خان سے کہا تھا کہ آٹھ جماعتیں پڑھوا کر رحم علی کو بھی ساتھ لے جا لیکن وہ نہیں مانا' کہتا تھا کہ میں نے اس کی پیدائش کے وقت قسم کھائی تھی کہ خود بھوکا رہ لوں گا لیکن رحم علی کو زیادہ سے زیادہ تعلیم دلواؤں گا۔"

"اب کونسی جماعت میں ہے رحم علی؟"

"سولہویں جماعت کا امتحان دیکر آیا ہوا ہے۔"

"ماشا !! ماشا !!! کیا گھر ہی پر ہے؟"

"کسی سے ملنے گیا تھا بس آتا ہی ہو گا"

"اور بہن سکینہ؟"

"اور بہن سکینہ؟"

"سکینہ اندر ٹیپ پر گانے سن رہی تھی۔ میں نے اسے تمہارے لئے چائے بنانے کو کہا ہے"

"اس کی کیا ضرورت تھی میں کوئی مہمان تھوڑا ہی ہوں!"

"مہمان نہیں تو کیا ہو' کوئی پندرہ سال بعد آئے ہو...... اب تو تمہاری مونچھیں بھی سفید ہونے لگی ہیں۔ جب یہاں سے گئے تھے تو بچے تھے' اب تمہیں عینک بھی لگ گئی ہے"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں پچھلے چودہ پندرہ برسوں میں میرے حلئے میں خاصی تبدیلی آئی ہے۔ میں اب رحم علی کی طرح جوان تو نہیں رہا!"

ہم باتیں کر رہے تھے کہ سکینہ چائے کی ٹرے لئے داخل ہوئی۔ اس نے پرانا ریشمی سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس سے ملتا جلتا دوپٹہ گلے میں لٹکا ہوا تھا۔ مگر باپ کے سامنے آنے سے پہلے اسے اہتمام سے سر پر پھیلا دیا تھا لیکن جونہی اس نے علیک سلیک کے بعد جھک کر چائے کی ٹرے میز پر رکھی تو دوپٹہ سر سے سرک کر اپنی اصلی جگہ پر آ گیا'

بالوں کی لٹ پیچھے پھینک کر چائے بنانے لگی۔

سکینہ اب ادھیڑ عمر مگر صحت مند تھی۔ اس کے زیادہ تر بال سیاہ تھے البتہ اس کے چہرے کا رنگ اب زرد پڑ چکا تھا۔ دائیں رخسار پر ایک آدھ چھائی کا نشان بھی تھا جسے گھٹیا قسم کی کریموں کے ذریعے مٹانے کی کوشش کی گئی تھی' جس سے چھائی تو مدھم ضرور پڑ گئی تھی لیکن بالکل مٹی نہیں تھی۔ اس نے کانوں میں سونے کا ایک ایک رنگ اور ناک میں نگ والا سنہری کیل پہن رکھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں کاسنی رنگ کی چھ چھ چوڑیاں تھیں لیکن کام کاج کرتے وقت دائیں ہاتھ والی دو چوڑیاں ٹوٹ چکی تھیں۔

میں نے سکینہ کا حال پوچھا اور حالات بدلنے پر مبارک دی تو اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور کہا کہ جب میں' ابا اور امی ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے ویران کنوئیں سے اینٹیں اکھاڑ رہے تھے تو ابا جی کی کدال سنگ مرمر کی ایک یاد گاری سل پر پڑی تھی اور میں نے بچوں کی طرح کھل کر کہا تھا کہ شاید دولت سے بھری دیگ نکل آئی ہے لیکن ابا جی نے مجھے مایوس کرتے ہوئے کہا تھا کہ بنی دیگیں برآمد ہونے والی جن پریوں کی کہانیاں ختم ہو چکی ہیں۔ پر میرا اللہ میری باتیں سن رہا تھا' اس نے ہمیں دولت کی کئی دیگیں دے دی ہیں۔ ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی دیگیں نہیں' اپنی حلال کی کمائی کی دیگیں!"

"بڑی خوشی کی بات ہے۔ یہ بتاؤ کتنے بچے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔"

"رحم علی کے بعد اللہ تعالیٰ ایک لڑکا دیا جو پیدا ہوتے ہی فوت ہو گیا۔ اس کے بعد دو بیٹیاں ہوئی طلعت اور نزہت......"

"ہائیں اتنے مشکل نام!"

"یہ نام رحم علی نے رکھے تھے کہتا تھا اب پھلاں' شریفاں' فاطمہ اور سکینہ کا رواج ختم ہو گیا ہے......"

"ہاں' تو کیا کرتی ہیں طلعت اور نزہت؟"

"وہ یہیں ہائی سکول میں پڑھتی ہیں' طلی دسویں میں ہے' نزی آٹھویں میں"

"ماشا اللہ!"

اتنے میں رحم علی آ گیا اور بابا کلو مجھے اس کے حوالے کرکے خود عصر کی نماز پڑھنے چلا گیا۔ سکینہ برتن اٹھا کر اندر چلی گئی۔

رحم علی جسے میں نے بچپن میں میلا کچیلا اور گاؤں کے جوہڑ میں بھینسیں نہلاتے دیکھا تھا' اب نکھر کر بہت خوبصورت اور سجیلا جوان نکلا تھا۔ اس کا قد لمبا اور بدن چھریرا تھا۔ اس نے ڈاڑھی پر بلیڈ پھیر رکھا تھا جس سے اس کی گندمی رنگ کی جلد بہت ملائم لگ رہی تھی۔ اوپر والے ہونٹ پر مونچھوں کی پتلی سی لکیر تھی جسے ابھی قینچی سے کاٹنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ بس نرم نرم بال' اپنی قدرتی وضع میں!

رحم علی نے استری کیا ہوا شلوار کرتہ پہن رکھا تھا اور پاؤں میں باٹا کے براؤن سلیپر تھے۔ وہ بڑے تپاک اور احترام سے ملا۔ چائے پانی کے لیے پوچھا اور پھر مجھ سے ایک کرسی چھوڑ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے اپنے پاس بلایا اور کہا۔ "بھئی' میں تم سے ملنے آیا ہوں اور تم ہم سے دور دور رہتے ہو!" وہ اٹھ کر میرے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گیا میں نے شفقت سے اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور اس کا حال پوچھا اس نے مجھے بتایا کہ پرائمری پاس کرتے ہی اباجی (بوٹا خان) نے اسے شہر داخل کروا دیا تھا' اور جب اس نے میٹرک کیا تو ابا جی باہر چلے گئے اور انہوں نے کہا بیٹا میں کماتا جاتا ہوں' تم پڑھتے جاؤ۔ اتنا پڑھو کہ میرے حصے کا بھی پڑھ ڈالو' چنانچہ میں پڑھتا گیا' اب ایم اے کا امتحان دے کر آیا ہوں۔"

"ویری گڈ' ویری گڈ۔ کس مضمون میں"

"پولیٹیکل سائنس میں۔ آگے لا' کرنے کا ارادہ ہے"

"اور بی اے میں کیا سبجیکٹ تھے؟"

"اکنامکس' پولٹیکل سائنس۔"

"اکنامکس کیوں چھوڑ دی؟"

"انٹر اور بی اے میں اکنامکس لینے سے اس مضمون میں میرا بیک گراؤنڈ بن گیا ہے۔ لاء کرنے کا ارادہ تھا اس لئے پولٹیکل سائنس کو ترجیح دی۔ اکنامکس تو بنک وینک میں

نوکری کرنے کے لیے مفید رہتی ہے۔"

"یو آر رائٹ۔"

میں نے رحم علی کے ماضی کے کارنامے اور مستقبل کے منصوبے سننے کے بعد اس سے پوچھا کہ ایک باشعور نوجوان کی حیثیت سے اسے گاؤں میں کوئی خاص تبدیلی نظر آئی' تو اس نے کہا۔ "اس میں ذہین اور باشعور ہونے کی کیا بات ہے' اب تو اندھوں کو بھی نظر آرہا ہے کہ سارا نقشہ ہی بدل گیا ہے لوگ جدید سہولتوں سے آشنا ہو چکے' پیسہ گھر گھر آچکا ہے' سارے گاؤں میں صرف اکا دکا خاندان ایسے رہ گئے ہیں جو نسبتاً غریب ہیں لیکن انہوں نے بھی باہر جانے والوں کی زمین بٹائی پر لے رکھی ہے۔ آبپاشی کے لیے کنوئیں کھدوا لئے ہیں' بارانی زمین سیراب ہونے لگی ہے۔ کاشت کاروں کی بھی حالت بدل گئی ہے۔ میرے خیال میں ملک میں فی کس آمدنی اتنی نہیں بڑھی جتنی ہمارے گاؤں میں بڑھی ہے۔ اس ECONOMIC BOOM کے CONSEQUENCES SOCIAL تو ہونے تھے۔"

"میں نے تو یہاں ملک جابر علی کے خلاف نفرت کی بہت تندو تیز لہر دیکھی ہے تمہارا کیا خیال ہے؟"

"یہ اسی ویو (WAVE) کا حصہ ہے جس کا میں نے ذکر کیا ہے یہ توINVIT ABLE ہے اب تو جاگیریں' جاگیرداریاں اور جاگیردار سب کے سب OUTDATED CONCEPTS ہو چکے ہیں۔ اب تو لوگ اپنا حق مانگتے ہیں' اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں اب وہ SUBSERVIENT نہیں رہے بلکہ اپنے آپ کو SOVEREIGN سمجھتے ہیں۔"

"کیا خیال ہے جاگیر داری نظام خود بخود دھڑام سے گر پڑے گا؟"

"یوں آٹومیٹک اور ڈرامیٹک طریقے سے تو نہیں البتہ یہ فیڈ آؤٹ ضرور ہو جائیگا ہاں' اگر کسی نے اس ڈوبتے سورج کے ساتھ چمٹنے کی کوشش کی تو خود بھی اس کے ساتھ ڈوب

جائیگا اور اگر RESIST کیا تو...... تو بلڈشیڈ ہو گا جسے AVOID کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ایڈجسٹمنٹ! RESISTANCE سے یقیناً تصادم ہو گا' ہر چیز ریزہ ریزہ ہو جائیگی"

ہماری گفتگو جاری تھی کہ بابا کلو بھی عصر کی نماز پڑھ کر آگیا۔ میں نے اسے بھی شریک گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

"بابا! میں اور رحم علی گاؤں کی بدلی بدلی فضا کی بات کر رہے تھے' آپ کا کیا خیال ہے؟"

"بیٹے ہوا بندھ جاتی ہے کسی چیز کی! ایک زمانہ تھا کہ جاپانی کپڑے کی ہوا بندھی ہوئی تھی' پھر میکسی پاک گندم کی ہوا بندھ گئی' اب ملک صاحب کی مخالفت کی ہوا بندھ گئی ہے۔ پتہ نہیں کیوں' لیکن ملک صاحب کی مخالفت ہے بہت! شانتی نگر کا بچہ بچہ ان کے خلاف ہو گیا ہے حالانکہ وہ اتنا ظالم آقا نہیں ہے۔"

رحم علی نے اپنے بابا کی بات کاٹتے ہوئے کہا "ابا جی! آپ کس دنیا میں رہتے ہیں! نفرت ابھارنے کے لیے ظالم ہونا ضروری نہیں' آقا ہونا ہی کافی ہے۔ اب کوئی کسی کو آقا ماننے کو تیار نہیں۔"

بابا کلو نے اپنے پوتے سے براہ راست بحث کرنے کی بجائے میری طرف منہ کرکے کہا۔

"دیکھئے نا' سرکاری سہولتیں تو اب آئی ہیں۔ سب سے پہلے گاؤں سے جرنیلی سڑک تک کا راستہ تو ملک صاحب نے پکا کروایا تھا' گاؤں والوں کی محنت مزدوری کے لیے فیکٹریاں انہوں نے لگوائی تھیں۔ غریب غربا کی مدد وہ کرتے تھے قبرستان کی چار دیواری انہوں نے بنوائی تھی۔"

رحم علی پھر بیچ میں بول پڑا۔

"ابابا جی! آپ نہیں سمجھ سکتے کہ ملک صاحب نے اس گاؤں کے رہنے والوں کے ساتھ

کیا سلوک کیا۔ وہ کالے آدمی سے بات کرنا تو اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔ ہمارے دکھ سکھ میں شریک ہونا تو دور کی بات ہے' وہ تو غریبوں سے نفرت کرتے ہیں انہیں تو مزارعوں سے شکاری کتے زیادہ عزیز ہیں۔ آپ کو مجھ سے بہتر پتہ ہو گا کہ انہوں انہوں نے چند فرلانگ لمبی سڑک ہمارے لئے نہیں اپنی چھوٹی بیگم عذرا کے لیے بنوائی تھی' فیکٹری میرے اور آپ کے لیے نہیں اپنے بیٹے قدیر کے لیے بنوائی تھی......"

یہ کہہ کر رحم علی نے اپنی پنڈلی سے شلوار کا پائنچہ اوپر کھینچا اور کہا۔ "یہاں بچپن میں مجھے جونک نے کاٹا تھا جس جونک نے میرا خون پیا تھا' وہ سوج کر ملک صاحب کی گھنی مونچھ کی طرح پھیل گئی تھی اس کا نشان اب بھی موجود ہے اور صدیوں سے ملک جابر علی اور ان کے بڑوں نے ہمارا اور ہمارے آباء و اجداد کا جو خون چوسا ہے اس کے نشان کس طرح مٹ سکتے ہیں! یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے معاشرے کو لخت لخت کیا ہے۔ قائداعظم نے ایک پاکستان بنایا' انہوں نے اس کے کئی پاکستان بنا ڈالے ہیں۔

ہم ایک ہی شانتی نگر میں رہتے ہیں لیکن ان کا شانتی نگر الگ ہے اور ہمارا الگ ہم میں کوئی چیز مشترک نہیں ہماری اقدار' ہماری VOCABULARY ہمارا کلچر اور ہمارا طرز زندگی الگ الگ ہے۔ ہم اپنے والد کو باپ یا ابا کہتے ہیں اور وہ ڈیڈی۔ ہم دو وقت کے رزق کو کھانا کہتے ہیں' وہ اسے لنچ یا ڈنر کا نام دیتے ہیں۔ ہمارے گھر میں کوئی اجنبی مرد آ جائے تو ہم اپنی عورتوں کو اندر بھیج دیتے ہیں' اور وہ مصافحہ کروا کے ان کا تعارف کراتے ہیں۔ ہماری خوراک دال' ساگ' گوشت سبزی ہے' وہ سوپ' گولڈ فش' ہنٹر بیف' کولڈ کٹلس اور ہاٹ کافی کی بات کرتے ہیں۔ ہمارا لباس شلوار' تہبند' کرتہ' قمیض' پگڑی اور ٹوپی وغیرہ ہے جبکہ ان کے کپڑوں میں انڈر گارمنٹس' نکٹائی' برجس' ہنٹنگ کیپ' ڈنر جیکٹ' مفلر اور چیسٹر وغیرہ ہیں یہاں تک کہ ہمارے اور ان کے قبرستان بھی الگ الگ ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ فرق تو ہمیشہ رہا ہے اور رہے گا۔ تم نظام قدرت ہی کو دیکھ لو' سورج

طلوع ہوتا ہے تو سب سے پہلے حویلی کے کلس منور کرتا ہے جبکہ گاؤں والے سردی میں ٹھٹھرتے رہتے ہیں' اور جب سورج ڈوبنے لگتا ہے تو سب سے پہلے ہمارے صحنوں سے اپنی روشنی سمیٹتا ہے اور آخری وقت تک اپنی روپہلی کرنیں حویلی کے اونچے میناروں پر پھینکتا رہتا ہے۔ آپ کس کس چیز کو بدلیں گے؟"

رحم علی بولا۔ "ہم مساوات کے خواہش مند نہیں ہیں' یہ ایک ایسا یوٹوپیا (UTOPIA) ہے جسے دیکھنا کسی کو نصیب نہیں ہوگا۔ ہم تو احتجاج کرتے ہیں اس غیر انسانی رویے پر جو اس اقتصادی بے انصافی یا ECONOMIC DISPARITY کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔ کہاں فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے کہ اگر تمہارے پاس چند پیسے زیادہ ہیں تو اپنے ہم جنسوں کو حقارت سے دیکھو' ان پر کاٹھی ڈال لو' انہیں ڈھور ڈنگروں کی طرح TREAT کرو؟ ہم تو ان کا ATTITUDE بدلنا چاہتے ہیں' ان کی دولت چھیننا نہیں چاہتے......"

بابا کلو نے اس کی بات کاٹ کر مجھ سے کہا۔

"پتر! تو ہی سمجھا رحم علی کو' گاؤں والے تو جاہل اور ان پڑھ ہیں یہ پڑھا لکھا ہو کر جاہلوں والی باتیں کرتا ہے انہیں سمجھانے کی بجائے خود ان کے ساتھ مل گیا اور انہیں شہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب حویلی کے اونچے مینار جھک جائیں گے۔ یہ نہیں سمجھتے کہ ملک صاحب کے پاس کتنی طاقت ہے۔ چار بیٹے اور کوئی چار سو نوکر ہیں ان کے! ہتھیاروں کا حساب ہی نہیں۔ پھر پولیس اور سرکار بھی انہی کی طرف ہے۔ خواہ مخواہ ٹکر لینے کا فائدہ! بیٹا' سمجھاؤ' اسے سمجھاؤ!"

ان فکری اور سماجی تبدیلیوں کے باوجود ملک جابر علی اپنے روایتی اقتدار سے چمٹے ہوئے تھے۔ گاؤں والے تو اپنی جگہ' ملک صاحب حویلی کے اندر بھی کسی کو شریک اقتدار کرنے کو تیار نہ تھے۔ بظاہر ان کا بڑا بیٹا پرویز ان کے اقتدار کا سب سے بڑا ستون تھا لیکن در حقیقت وہ بھی ملک صاحب کی مطلق العنانی سے نالاں تھا۔

ایک دن ملک صاحب زمینوں کا چکر لگا کر آئے سیدھے اپنے کمرے میں جانے کی بجائے

لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے قیمتی کپڑے کا براؤن رنگ کا شلوار کرتہ پہن رکھا تھا اور گلے میں ٹائی کی جگہ مفلر کو گانٹھ دے رکھی تھی' غالباً مارچ کا مہینہ تھا۔ علی الصبح جب ملک صاحب حلیم طبع سفید گھوڑی پر بیٹھ کر مربعوں کی طرف روانہ ہوئے تھے تو فضا میں کچھ خنکی تھی اس لئے کرتے کے اوپر بغیر بازو والا سویٹر' براؤن مفلر اور جرابیں پہن گئے تھے لیکن جب واپس آئے تو دوپہر ہو چکی تھی' ان کے بوڑھے مگر گورے چہرے پر دھوپ کی تمازت کے آثار نظر آ رہے تھے' ماتھے پر پسینے کی بوندیں بھی تیر رہی تھیں اور وہ تھکے لگ رہے تھے۔ انہوں نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اپنا ڈنڈا (کھونڈا) ایک کونے میں رکھا اور اپنے آپ کو چیسٹر فیلڈ ڈیزائن کے پرانے صوفے پر پھینک دیا۔ گلے سے مفلر اتار کر ساتھ والے صوفے کے بازو پر رکھا اور رومال نکال کر پسینہ پونچھنے لگے۔ ایک ملازم آیا اور ان کے قدموں میں بیٹھ کر ان کے چپل اور جرابیں اتارنے لگا۔ دوسرا ملازم مشروبات کی ٹرے اٹھا کر حاضر ہو گیا۔

ملک صاحب ذرا ستا کرتا زہ دم ہوئے تو انہوں نے پوچھا عذرا کہاں ہے۔ کرمے نے بتایا کہ وہ ڈرائیور کو ساتھ لے کر شہر گئی ہیں' کہہ رہی تھی کچھ چیزیں خریدنا ہیں' دوپہر کے کھانے تک واپس آجائیں گی۔

"اور ذکیہ؟"

پھتو بولا "جی وہ اپنے کمرے میں ہیں' کچھ سر درد کی شکایت کر رہی تھیں!" اتنے میں ملک صاحب کا بڑا بیٹا پرویز دو تین غیر ملکی رسالے اٹھائے اندر داخل ہوا اور سلام کر کے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ باپ بیٹے کو اکٹھے دیکھ کر دونوں ملازم چلے گئے ملک صاحب نے کہا۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ آج حویلی کے شمالی جانب باغوں کا چکر لگا آنا؟"

"جی ڈیڈی! میں گیا تھا' ابھی واپس آیا ہوں۔"

"کیا دیکھا؟"

"بس اچھی رپورٹ ہے۔ قربان کہہ رہا تھا کہ باغ تیار ہیں خصوصاً کینو' مالٹے اور امرود

کے باغ بالکل تیار ہیں......"

"کوئی گاہک آیا ہے؟"

"جی ہاں - وہ بتا رہا تھا کہ دو تین لوگ پھیرا لگا گئے ہیں۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ کس

رینج میں فروخت ہوتے ہیں یہ باغ ہر سال ' قربان نے اپنے اندازے سے ساڑھے پانچ لاکھ روپے بتا دیا۔"

"صرف ساڑھے پانچ لاکھ ! اس الو کے پٹھے کو کیا پتا۔"

"صرف امرود کے باغ کی بات کر رہا تھا وہ' کینو اور مالٹے کے باغوں کے تو اس نے آٹھ لاکھ روپے بتائے۔"

پھر بھی کم ہیں۔ یہ تو پچھلے سال کے ریٹ ہیں جب انفلیشن (INFLATION) کا ریٹ تیرہ فیصد تھا۔ اس سال انفلیشن ڈبل ہو چکی ہے' ڈالر کی قیمت بھی گیارہ روپے سے بڑھ کر پندرہ روپے ہو چکی ہے اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ جس چیز کا پتہ نہ ہو اس کے بارے میں منہ نہیں کھولنا چاہیے۔ خیر تم بتاؤ۔ تم نے قربان کو کیا بتایا۔"

"میں نے تو یہی کہا کہ ملک صاحب سے پوچھ کر بتاؤں گا۔"

"شاباش ! کسی سے کمٹ (COMMIT) نہ کرنا کچھ اور اس قربان کے بچے کو بھی تاکید کر دینا کہ یونہی بکواس نہ کرتا پھرے۔ کرنٹ ریٹ میں بتاؤں گا' صرف میں!

"جی ڈیڈی!"

"اور یہ رسالے کیا اٹھائے پھر رہے ہو؟"

"یہ غیر ملکی رسالے ہیں۔ کئی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ موقع ملے تو آپ کے نوٹس میں یہ بات لاؤں کہ آپ نے تین نئے ٹریکٹر خریدنے کا جو فیصلہ کیا ہے تو میرے خیال میں نکولس ٹریکٹر خرید لیں"

"کیوں؟"

"اس رسالے میں ان ٹریکٹروں کے متعلق بہت اچھا رائٹ اپ ہے' ساتھ تصویریں بھی ہیں۔ لکھا ہے کہ یہ ٹریکٹر LATEST TECHNOLOGY کے مطابق تیار کئے گئے ہیں

جو گرم آب و ہوا کے لیے بہت موزوں ہیں۔ ڈیزل بھی بہت کم کھاتے ہیں' قیمت بھی کم ہے اور THIRD WORLD COUNTRIES میں بڑے پاپولر ہو رہے ہیں"

ملک صاحب کا رد عمل بڑا مشفقانہ تھا۔ انہوں نے پرویز کو جھڑکنے کی بجائے بڑے پیار سے کہا۔

"پرویز! تم بچے کے بچے ہی رہے' کچھ نہیں سیکھا تم نے ان بیس سالوں میں میرے ساتھ کام کرتے"

پرویز خاموش بیٹھا رہا۔

ملک صاحب نے اپنی بات جاری رکھی۔

"سنی! تم کیسے چلاؤ گے یہ کاروبار میرے بعد' تم تو ایک رسالے میں ایک مضمون پڑھ کر ہی بھٹک گئے۔ تم اصل ٹرک (TRICK) سمجھ نہیں پائے۔"

"جی وہ کیا ہے؟"

"ٹرک یہ ہے کہ یہ ٹریکٹر کسی اشتراکی ملک نے تیار کیا ہے جس نے جان بوجھ کر اس کی قیمت اور ڈیزل کی کھپت کم رکھی ہے تاکہ اس ٹریکٹر کے ذریعے اشتراکی ممالک کی ٹیکنالوجی تیسری دنیا کے ممالک میں INTRODUCE کی جائے اور پھر اس ٹیکنالوجی کے ذریعے وہاں اشتراکی اثر و رسوخ پھیلایا جائے۔"

"آپ نے پڑھا ہے کچھ ان ٹریکٹرز کے بارے میں؟"

"سنی! مجھے اس عمر میں کچھ پڑھنے کی ضرورت نہیں' میں ان کی سازشوں کی جانتا ہوں اس لئے میں نے پچھلے ہفتے ٹریٹ ٹریکٹرز کا آرڈر دے دیا تھا۔ امید ہے کہ اگلے مہینے کے اینڈ (END) تک آ جائیں گے۔"

"لیکن ڈیڈی! آپ جن ٹریکٹرز کا آرڈر دے چکے ہیں' انہیں تو اب کوئی بھی خرید نہیں رہا۔ وہ اپنے ملک میں ترک کئے جا رہے ہیں۔ اب تو"

"تم نہیں جانتے پرویز' میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے۔ جن ٹریکٹرز کا میں نے آرڈر دیا ہے وہی بہترین ہیں۔"

پرویز اپنا سامنہ لیکر رسالے اٹھائے چل دیا۔
ایک دن ملک صاحب ذکیہ کو ساتھ لے کر شہر جانے لگے تو مہابت خان ڈرائیور نے ٹیوٹا ڈی لکس گاڑی حویلی کی سیڑھیوں کے پاس لگا دی۔ مہابت خان نسبتاً نیا ڈرائیور تھا۔ بمشکل تین مہینے پہلے گیراج کے انچارج رحم داد کی سفارش پر بھرتی کیا گیا تھا اور آج تک اس نے جس کسی کیساتھ ڈیوٹی دی تھی' وہ اس کی تعریف کرتا تھا۔ پہلے وہ ڈاج پر رہا۔ پھر سرکاری افسروں کو دیجانے والی ٹویوٹا مارک ون پر رہا' پھر وہ چھوٹی بیگم کو مرسیڈیز میں شہر لے جاتا رہا لیکن آج ملک صاحب کے ساتھ اس کی ڈیوٹی کا پہلا موقع تھا۔ وہ ڈرائیوروں کی وردی پہنے گاڑی کے پاس مودب کھڑا تھا۔ ملک صاحب انگریزی سوٹ پہنے' ہاتھ میں چھڑی لئے حویلی کی سیڑھیاں اترنے لگے ان کے پیچھے پیچھے بیگم صاحبہ تھی جو اتنی موٹی ہو چکی تھیں کہ چلنے پھرنے میں بھی دقت محسوس کرتی تھیں۔ ان کی ملازمہ انہیں تھام کر سیڑھیوں سے نیچے اتار رہی تھی۔ کرمے نے ملک صاحب کو چھڑی کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترتے دیکھا تو وہ جلدی سے آگے بڑھا تا کہ انہیں سہارا دے سکے لیکن جونہی اس نے ملک صاحب کا بازو تھا' ملک صاحب وہیں رک گئے اور چھڑی سے جھڑک کر اسے پیچھے کیا اور غصے سے کہا۔
"ہٹ جاؤ کرمے! کیا بکواس ہے' کیا تم مجھے اتنا کمزور سمجھتے ہو کہ میں سیڑھیاں بھی نہیں اتر سکتا۔" کرما کھسیانا ہو کر پیچھے ہٹ گیا اور کہنے لگا۔
"نہیں صاحب! ماشاء اللہ آپ تو ابھی جوان ہیں۔ ہم جو آپ کے سامنے پیدا ہوئے ہیں' بوڑھے ہو گئے ہیں۔ مگر آپ تو ابھی تک جوان ہیں جی! اللہ تعالی نے کیا صحت دی ہے"
ملک صاحب نے کہا۔ "مجھے ایسی خوشامد پسند نہیں بند کرو یہ بکواس!"
"جی' میں آپ کا پرانا نمک خوار ہوں۔ مجھے معلوم ہے خوشامد تو آپ کو کبھی بھی پسند نہیں تھی مگر میں تو حق بات کہہ رہا تھا کہ ماشاء اللہ آپ کی صحت"
ملک صاحب اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے سیڑھیاں اتر گئے۔ مہابت خان ڈرائیور

نے اپنی پی کیپ درست کی اور دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ ملک صاحب بھی سیڑھیاں اتر کر کار کے پاس پہنچ گئے۔ کرما اور حویلی کے دوسرے لوگ سمجھے کہ شاید بڑی بیگم

کے اترنے کا انتظار کر رہے ہیں یا اپنا پھولا ہوا سانس درست کر رہے ہیں لیکن درحقیقت وہ ڈرائیور مہابت خان کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ کوئی ایک منٹ تک متواتر اس کی طرف دیکھتے رہے پھر اسے اپنی طرف دیکھنے کا حکم دیا۔ ملک صاحب نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور وہیں کھڑے کھڑے فیصلہ دے دیا کہ تم ہمارے ساتھ ڈیوٹی نہیں کرو گے۔ جاؤ گیراج سے نور داد کو بھیجو!

کرما اور مہابت خان' دونوں گیراج کی طرف بھاگے اور وہاں سے نور داد ٹوپی لیکر دوڑا دوڑا آیا۔ ملک صاحب اور ذکیہ گاڑی میں بیٹھے اور شہر چلے گئے لیکن کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ اچانک مہابت خان میں کیا خامی نظر آئی کہ اسے واپس گیراج میں بھیج دیا اور اس کی جگہ نور داد کو شہر لے گئے۔ نور داد میں آخر ایسی کونسی بات تھی' وہ تو ایسا پکا ڈرائیور بھی نہیں ہے!

دراصل جوں جوں ملک صاحب عمر کے آخری حصے میں داخل ہو رہے تھے' انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ رفتہ رفتہ حویلی پر ان کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی ہے اور کسی دن حویلی کا کوئی کارندہ ان کے زوال کا سبب بن جائے گا' اسی لئے وہ کسی حد تک وہمی بھی ہو گئے تھے۔ شہر سے واپس آکر جب ذکیہ نے مہابت خان کو ہٹانے کی وجہ پوچھی تو ملک صاحب نے کہا۔

"مہابت خان' عذرا کا FAVOURITE ڈرائیور ہے۔ عذرا خود کئی مرتبہ اس کی تعریف کر چکی ہے وہ ایک پڑھی لکھی عورت ہونے کے باوجود تم سے جلتی ہے۔ اسے میرا اور تمہارا اکٹھے پھرنا ہرگز پسند نہیں۔ میں نے کار میں بیٹھنے سے پہلے مہابت خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی وحشت نظر آئی۔ یہ نارمل آنکھیں نہیں تھیں' یہ تو ڈرائیور کی نہیں' کسی خطرناک آدمی کی آنکھیں

تھیں۔"

"وہ ہمارے لئے کیسے خطرناک ہو سکتا ہے؟"

"تم نہیں جانتیں۔ ان چھوٹے چھوٹے لوگوں سے بھی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے' کیا پتہ ایکسیڈنٹ کے بہانے یہ ہماری جانوں سے کھیل جائے!"

"ہائے اللہ! ایسا بھی ہو سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا۔ مجھے تو آج تک یقین نہیں آیا کہ زلفی کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ مجھے شک ہے کہ اسے کسی نے مروا دیا تھا۔"

"اسے کون مروا سکتا ہے' بس اس کی زندگی ہی اتنی تھی۔"

"تم نہیں سمجھتیں۔ اس کے سو دشمن ہو سکتے ہیں' عذرا تم پر شک کر سکتی ہے کہ تم نے اپنی سوکن کا لڑکا سمجھ کر اسے مروا دیا' میں ضمیر پر شک کر سکتا ہوں کہ وہ اپنی جائیداد کے نئے حصہ دار کو راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔"

"لیکن ضمیر کو تو جائیداد سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"تو پرویز کے دل میں شیطان وسوسہ ڈال سکتا ہے' آخر پرویز کو تو جائیداد میں دلچسپی ہے!"

"نہیں' میرے کسی بیٹے کو جائیداد سے دلچسپی ہو یا نہ ہو' زلفی کو قتل کروانے کی حرکت نہیں کر سکتا۔ وہ میرے بیٹے ہیں' میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں .... آپ خواہ مخواہ وہمی ہو رہے ہیں۔ نہ زلفی کے حادثے میں کسی شخص کا ہاتھ تھا اور نہ مہابت خان کی آنکھوں میں کسی سازش کے آثار تھے۔ وہ سب وہم آپ کے اپنے پیدا کردہ ہیں۔"

"تم کچھ نہیں جانتیں' ذکیہ! تم کچھ نہیں سمجھتیں۔"

ملک صاحب نے اپنی کمزوری تسلیم کرنے کی بجائے حسب معمول ذکیہ کو چپ کرا دیا اور بات ختم ہو گئی۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ ملک صاحب جو اب ستر سال کی عمر کو پہنچنے والے تھے پہلے والے دبنگ' حوصلہ مند اور بہادر نہیں رہے تھے' عمر کے ساتھ ساتھ

ان کی ہمت اور حوصلے میں بھی کمی آتی جا رہی تھی اور انہیں یہ وہم رہنے لگا تھا کہ یا تو کسی وقت اچانک موت کا فرشتہ آکر انہیں دبوچ لے گا یا گھر کا کوئی فرد ان کے اقتدار کا خاتمہ کر دے گا لیکن وہ اپنی اندر کی کمزوری کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے اور اسی طرح زمینوں' کارخانوں' باغوں حویلی میں اپنا سکہ چلاتے رہتے تھے اور سبھی ان کے سامنے جی حضور' جی جناب کی رٹ لگاتے رہتے تھے۔

میراں بخش کی بیوی شریفاں کئی برس پہلے پچھلی کوٹھڑی میں بخار سے چھپنے کی کوشش میں اس دار فانی سے رخصت ہو چکی تھی۔ بیٹی شیداں کی شادی ہو گئی تھی۔ دونوں لڑکے اسحاق اور فرمان علی باہر جا چکے تھے اور دونوں نے فی الحال شادی سے انکار کر دیا تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہ پہلے کمائیں گے' غربت مٹائیں گے' نیا مکان بنائیں گے' ساری حسرتیں پوری کریں گے اور پھر شادی کرکے اپنا گھر آباد کریں گے۔
اب گھر میں صرف بابا میراں بخش اور اس کی بہن مرجان رہ گئے تھے۔ مرجان بوڑھی اور بابا میراں بخش بہت ہی بوڑھا ہو چکا تھا۔ میراں بخش کا زیادہ تر وقت مسجد میں گزرتا۔ وہ ظہر کی نماز پڑھ کر آتا' تھوڑی دیر گھر میں رکتا پھر عصر پڑھنے چلا جاتا۔ کبھی واپس گھر آجاتا اور کبھی وہیں مسجد ہی میں بیٹھا رہتا اور مغرب کی نماز ادا کرکے گھر آتا۔ مرجان اسے کھانا دیتی اور وہ کھانا کھا کر اور حقے کے چند کش لگا کر عشاء کے لیے مسجد چلا جاتا۔ واپس آ کر سیدھا چارپائی پر جا لیٹتا اور سو جاتا۔
مرجان اب شکارن نہیں رہی تھی جس کی ایک وجہ تو شاید یہ تھی کہ اب وہ خود بوڑھی ہو گئی تھی' اس کا گوشت لٹک گیا تھا' اب پنجوں کے بل مٹک مٹک کر چلنے کی اس میں ہمت نہیں رہی تھی' اور دوسری وجہ غالباً یہ تھی کہ گاؤں کے اکثر نوجوان رزق کی تلاش میں شانتی نگر سے باہر جا چکے تھے' جب وہ واپس گاؤں آتے تو ان کی نظریں چچڑ مرجان کی بجائے ترو تازہ لڑکیوں پر پڑتیں جو خود کسی دوبئی یا ولائت والے کے ساتھ

شادی کرنے کے در پے ہوتیں۔

البتہ میراں بخش کا مکان بہت کھلا ہو چکا تھا۔ اگرچہ مکان والی جگہ وہی پرانی تھی لیکن پرانے کوٹھے کو گرا کر اس کی جگہ نئی وضع کا خوبصورت مکان تعمیر کیا گیا تھا۔ پرانی کوٹھڑی جو بھوسے' چارے' پرانے سامان اور ڈھور ڈنگر کے لیے مخصوص تھی' گرا دی گئی تھی۔ سامنے والی ڈیوڑھی بھی ہٹا دی گئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے سٹور اور باورچی خانے وغیرہ بھی گرا دیئے گئے تھے اور یوں اچھی خاصی کھلی جگہ نکل آئی تھی جس پر اسحاق اور فرمان علی نے شہری ڈیزائن کے مطابق ایک بنگلہ نما مکان کھڑا کر دیا تھا۔ اس مکان کو خوب پلستر اور پینٹ کرکے چمکایا گیا تھا اور اس میں ضرورت کی تمام اشیاء یعنی ریڈیو' ٹیلی ویژن' فرج' ڈنر سیٹ اور واٹر سیٹ وغیرہ موجود تھے۔ اسحاق اور فرمان نے گاؤں سے باہر بھی جگہ خرید کر ایک ڈیرا بنا رکھا تھا جو ابھی نامکمل تھا اور فی الحال مردانہ بیٹھک یا مہمان خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

میراں بخش کے ہاں ایک دن جانا ہوا تو مرجان گھر میں اکیلی تھی۔ آج سے پندرہ بیس سال پہلے میں اگر اسے گھر میں اکیلے پاتا تو شاید الٹے پاؤں بھاگ آتا لیکن اب جوانی کا جنون اتر چکا تھا اور ہر قسم کا خطرہ ٹل چکا تھا اس لئے میں السلام علیکم کہہ کر اندر چلا گیا۔ مرجان نے حسب معمول کالی شلوار' سفید قمیض اور ناک میں چمکدار کیل پہن رکھا تھا اور اس کے دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں اسی انداز میں اکڑی ہوئی تھیں جس انداز میں وہ کبھی تہبند کا ایک پلو اٹھا کر پنجوں کے بل مستانی چال چلتی تھی۔ اس نے بڑے تپاک سے میرا خیر مقدم کیا۔ برآمدے میں پلنگ کے پاس میرے لئے کرسی بچھائی اور میرے منع کرنے کے باوجود ساتھ والے باورچی خانے میں چائے کے لیے پانی رکھ دیا۔

میں نے مرجان اور دوسرے گھر والوں کا حال پوچھنے کے بعد گفتگو کا رخ ملک جابر علی کی طرف موڑ دیا۔ مرجان نے چھوٹتے ہی کہا۔

"پھوکا آدمی ہے' بالکل پھوکا!"

"کیا مطلب؟"

"امجد صاحب! میں کوئی گریزی نہیں بول رہی۔ تم نے ملک صاحب کا ذکر چھیڑا میں نے بتا دیا پھوکا آدمی ہے۔ کیا پھوکا کا مطبل نہیں آتا تجھے؟"

"کچھ کچھ سمجھتا ہوں۔"

"کچھ کچھ کیا سمجھو گے' پورا مطبل سمجھو۔ پھوکا آدمی کہتے ہیں نامرد کو یعنی ایسے آدمی کو جس کی مونچھیں داڑھی تو ہوں لیکن اندر سے بھُس ہو' چلے ہوئے کارتوس کی طرح۔ سمجھے یا اور تمثیل (تفصیل) بیان کروں؟"

میں نے جھینپ کر کہا۔

"وہ تو میں سمجھ گیا' مزید تفصیل کی ضرورت نہیں' لیکن......."

"لیکن ویکن کیا"

"لیکن وہ تو بڑا دبنگ آدمی مشہور ہے۔ اتنی بڑی حویلی کا مالک ہے' کئی مربعے ہیں۔"

"کیا مربعوں سے انسان مرد بن جاتا ہے؟ اگر کچھ پلے ہو تو آدمی مرد بنتا ہے!"

"لیکن اس کی مردانگی میں کیا شک ہے۔"

"میرا منہ نہ کھلواؤ۔ اگر وہ مرد ہوتا تو عذرا بی بی یوں در در نہ پھرتی اپنی پیاس بجھانے کے لیے۔"

"مرجان! تم تو ایسے وثوق سے باتیں کر رہی ہو جیسے تم ملک صاحب اور ان کی حویلی کے سارے راز جانتی ہو۔"

"مجھے ان پڑھ نہ سمجھو' میں سب کچھ جانتی ہو' چلنے پھرنے والی عورت ہوں۔ گھر گھر کا بھید جانتی ہوں' گاؤں والوں کا بھی اور حویلی والوں کا بھی! میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ ملک صاحب پھوکا آدمی ہے' جس طرح میں نے چائے بنانے کے لیے چولہے میں پھونک ماری ہے اگر اس طرح ملک صاحب پر پھونک مار دو تو وہ اڑ جائے۔"

"لیکن اس کا تو بڑا رعب ہے سبھی اس سے ڈرتے ہیں۔"

"تم بہت جماعتیں پڑھے ہوئے ہو' میں پڑھی ہوئی نہیں لیکن گڑھی ہوئی ہوں۔ میری

یہ بات پلے باندھ لو کہ جس شخص کا باہر سے جتنا زیادہ دبدبہ ہو گا' اندر سے وہ اتنا ہی پھوکا ہو گا..... آزما کر دیکھ لینا' اور اگر مرجان کی یہ بات غلط ثابت ہو جائے تو میری

گت (چوٹی) کٹوا دینا۔"

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ میراں بخش عصر کی نماز پڑھ کر آ گیا۔ مرجان جو دوسروں کے سامنے اتنی منہ پھٹ تھی' اپنے بوڑھے بھائی کا بہت احترام کرتی تھی' چنانچہ میراں بخش کے آتے ہی وہ اٹھ کر ادھر ادھر ہو گئی اور میں میراں بخش سے باتیں کرنے لگا۔

میراں بخش نے ملک صاحب کی باتیں سنیں تو کہنے لگا۔

"میرے خیال میں ملک صاحب بہت اچھے آدمی ہیں اور خدا ترس آدمی ہیں' گاؤں والوں اور حویلی والوں پر ان کے بہت سے احسانات ہیں۔ ہمارے قبرستان میں گدھے چرتے رہتے تھے اور ان کے کھر ہمارے بزرگوں کی قبروں میں دھنس جاتے تھے' ملک صاحب نے اپنے خرچ پر پرانے قبرستان کے ارد گرد چار دیواری بنوا دی۔ پھر ہم سب کی سہولت کے لیے بڑی سڑک تک راستہ پکا کروا دیا۔ جب بھی کوئی شخص ان کے پاس حاجت لے کر گیا تو انہوں نے اس کی حاجت روائی کر دی ورنہ امجد بیٹے تم خود سوچو اتنے اونچے آدمی کو کیا فرق پڑتا ہے کہ کس کی بیوی کو علاج کی ضرورت ہے' کس کی بیٹی کو شادی کے لیے جہیز درکار ہے' کس کو......"

"لیکن میں نے تو ان کے خلاف بہت سی شکایتیں سنی ہے۔"

"لوگ کسی کے خلاف شکایتیں نہیں کرتے! یہاں فرشتہ تو کوئی ہے نہیں' اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا ہے....."

"لیکن وہ تو بڑا جابر اور ظالم مشہور ہے!؟"

"غلط بات ہے ظالم اور جابر تو اس کے باپ دادا ہوا کرتے تھے جو چیز پسند آ جاتی' اس پر قبضہ کر لیا کرتے تھے......یہ ملک صاحب تو سابقہ ملکوں کے مقابلوں میں فرشتہ ہیں' فرشتہ!"

"میں نے تو سنا ہے کہ انھوں نے ایک دفعہ آپ کے بیٹے فرمان اور اس کے ساتھیوں کو کنوئیں پر ورزش کرنے سے روک دیا تھا۔ کسی اور کو اپنے مربعوں میں سے گذرنے سے منع کر دیا تھا اور ایک دفعہ گلابے کی بکریاں ان کے باغ میں چلی گئی تھیں تو اس کا منہ کالا کر کے ناک سے لکیریں نکلوائی تھیں......"

"یہ معمولی باتیں ہیں بیٹا۔ ہمارے بڑوں نے تو بڑے بڑے ظلم سہے ہیں' بڑی بڑی ماریں کھائی ہیں' ساری ساری عمر ناکیں رگڑی ہیں' ساری ساری رات ملکوں کے پاؤں دابے ہیں' ساری ساری عمر ان کی غلامی کی ہے۔ یہ ملک صاحب تو کسی کو کچھ کہتے ہی نہیں' بس اپنی حویلی اور اس کے معاملات ہی میں مگن رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی حیاتی کرے' وہ زیادہ سے زیادہ عرصہ زندہ رہیں' پتہ نہیں ان کے بعد کس کا دور آتا ہے اور وہ ہم غریبوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ میری دعائیں تو ملک صاحب کے ساتھ ہیں۔"

ملک صاحب کا بیٹا قدیر' ملک انڈسٹریل اسٹیٹ بڑی کامیابی سے چلا رہا تھا۔ اس نے ایک سال میں ساڑھے چار کروڑ روپے کا مال پیدا کیا تھا جس میں سے ڈیڑھ کروڑ روپے خالص منافع تھا۔ یہ رقم ملک جابر علی کے سپرد کر دی گئی تھی کیونکہ حویلی کا یہی دستور تھا۔ یہ روایت حویلی کے کئی مکینوں کو پسند نہ تھی کہ ہر کوئی محنت کرکے جو کچھ کمائے' وہ ملک صاحب کی جھولی میں ڈال دے اور پھر ملک صاحب کی طرف دیکھتا رہے کہ وہ کس کی ضرورت کو کتنی اہمیت دے کر اسے کتنی رقم دیتے ہیں' اگرچہ ملک صاحب دل کے سخی اور ہاتھ کے کھلے تھے اور ہر کسی کو اس کی توقع سے بڑھ کر دیتے تھے لیکن ہر وقت' ہر سال ان کا دست نگر رہنا کسی کو پسند نہ تھا۔ خصوصاً پرویز اور قدیر جو ان کی زرعی اور صنعتی پیداور کے ذمہ دار تھے' اس بات سے چڑتے تھے کہ سارا کنٹرول مرکزی ہے اور ہمیں اپنی کمائی سے بھی حسب منشا خرچ کرنے کی اجازت نہیں۔ لیکن وہ اس گلے کو ملک صاحب کے سامنے کبھی زبان پر نہ لاتے کیونکہ انہیں ڈر

تھا کہ ملک صاحب فوراً سے بغاوت کا نام دے دیں گے لہٰذا وہ اسی بندوبست پر قناعت کئے بیٹھے تھے کہ جو کچھ کمائیں' ملک صاحب کے سپرد کر دیں اور پھر ملک صاحب جو چاہیں' حاتم طائی بن کر انہیں دے دیں اور وہ حاتم طائی سے کچھ کم بھی نہ تھے۔
پرویز تین لاکھ روپے کی گاڑی خریدنا چاہتا تو اسے پانچ لاکھ کی گاڑی خریدوا دیتے۔ قدیر کی گاڑی بمشکل دو سال پرانی ہوتی تو اسے نئی کار خرید دیتے۔ ان کی بیویوں کو ہر دوسرے تیسرے سال اندرون ملک یا بیرون ملک شاپنگ کے لیے بھیج دیتے۔ لیکن اپنی مرضی کے مطابق' اپنے کنٹرول کر اندر!
بس میرے ذہن میں ایک ہی سوال کلبلا رہا تھا اور وہ یہ کہ جو شخص اپنے بچوں کے لئے اتنا سخی دل ہونے کے علاوہ دوسروں کے لئے اتنا رحم دل ہو کہ غریبوں کو مکان کی تعمیر کے لئے عطیہ دیدے' زچہ و بچہ کی مالی مدد کر دے' لاوارث کا کفن دفن کر دے' در پردہ غریب لڑکیوں کا جہیز بنوائے' وہ آخر اتنی شدید نفرت کا نشان کیسے بن گیا۔ تحقیق کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس نفرت کی اصل وجہ یہ ہے کہ ملک صاحب نے ہر چیز اپنی مٹھی میں لے رکھی ہے۔ ہر فیصلہ خود کرتے ہیں' اپنی پسند پر زور دیتے ہیں اور اختلاف رائے کو دشمنی اور غداری پر محمول کرتے ہیں جبکہ وقت بدل چکا ہے اور کیا حویلی والے اور کیا گاؤں والے سبھی اپنے اپنے میدان میں خود مختار بننا چاہتے ہیں' وہ اپنے معاملات خود طے کرنا چاہتے ہیں اور اپنے اختیارات کسی ایک شخص کے ہاتھوں میں مرتکز کرنے کو تیار نہیں۔
ملک صاحب نے جس طرح پرویز پر سخت کنٹرول کر رکھا تھا کہ وہ زمینداری کا انچارج ہونے کے باوجود اپنی پسند کا ٹریکٹر نہیں خرید سکتا تھا' اس طرح انہوں نے قدیر پر کڑی نظر رکھی ہوئی تھی۔ وہ اسے کام کی شاباش تو دیتے رہتے لیکن اختیارات ہرگز تفویض نہ کرتے۔ ایک دفعہ چاول کچھ زیادہ ہی ہوگئے۔ چاول چھڑنے کی مشینوں نے دن رات کام کرکے سینکڑوں ٹن چاول چھڑ دیئے جو ملک کے فیصلے کے مطابق ایک بڑی پارٹی کو فروخت کر دیئے گئے البتہ چاولوں کا بھس یا چھالی وہیں فیکٹری میں پڑی رہی جس سے

اچھی خاصی پہاڑی سی بن گئی تھی۔ ملک صاحب بھی کئی مرتبہ فیکٹری میں آئے اور اس ڈھیر کے پاس سے گذرے لیکن انہوں نے اس کے متعلق کوئی احکامات نہ دیئے۔

گرمیوں میں تیز ہوائیں چلنے لگیں تو یہ چھالی اڑ کر فیکٹری کی مشینوں تک پہنچنے لگی۔ ایک دن فور مین نے قدیر صاحب سے کہا کہ اسے اٹھوا دیں ورنہ نئی مشینیں خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ قدیر نے اگلے روز فیکٹری کے مزدور لگوا کر یہ سارا تودہ اس کچے راستے پر پھیلا دیا جو انڈسٹریل ایریا کو زمینوں سے ملاتا تھا۔ اس پر پانی کا چھڑکاؤ کروا کر رولر چلوا دیا اور یوں گرد آلود راستہ پکی سڑک کی طرح ہموار اور خوبصورت ہو گیا' جب ملک صاحب نے زمینوں کی نگرانی کرتے ہوئے اچانک یہ سڑک دیکھی تو سیدھے فیکٹری گئے اور قدیر کے دفتر میں جا کر اسے اچھی خاصی جھاڑ پلا دی کہ ان کی اجازت کے بغیر یہ چھالی کیوں استعمال کی گئی' اسے سڑک پر ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جب قدیر نے بتایا کہ وہ کئی ماہ سے بے کار پڑی تھی اور انہوں نے خود کئی دفعہ دیکھنے کے باوجود اس کی طرف توجہ نہ دی تو وہ سمجھا کہ اس بے کار چیز کا کچھ نہ کچھ استعمال کیا جائے' اور اس کے ذہن میں اس کا بہترین استعمال یہی آیا کہ اس سے راستہ بہتر بنایا جائے۔ ملک صاحب نے غصے سے کہا۔

"قدیر میاں! اس دنیا میں کوئی چیز بے کار نہیں ہوتی۔ ہر چیز کام آتی ہے۔ میں روز اس ڈھیر کو دیکھتا تھا اور خاموشی سے گزر جاتا تھا کیونکہ میں سردیوں کا انتظار کر رہا تھا تا کہ جب اس ڈھیر کی شہر میں ضرورت پڑے' اس کی ڈیمانڈ بڑھے تو اسے اچھے داموں بیچا جائے۔ تم نے اسے راستے پر پھکوا کر لاکھوں روپے خاک میں ملا دیئے ہیں۔ پتہ نہیں تم لوگ کب سمجھو گے' میرے بعد کس طرح کام چلاؤ گے......"

قدیر نے ہمت کرکے کہا۔ "آپ کچھ کام چلانے کا موقع دیں تو ہم سیکھیں بھی......"

"کیا خاک کام چلاؤ گے تم! پڑھ لکھ کر ضائع کیا ہے سب کچھ......تم جو چاولوں کے چھلکے کے اس ڈھیر کو منافع بخش طریقے سے ڈسپوزز آف (DISPOSE OF) نہیں کر

سکتے باقی کام کیا خاک چلاؤ گے' نالائق کہیں کے!"
ملک صاحب جلی کٹی سنا کر واپس چلے گئے۔

ملک فرمان علی کا ڈیرا گاؤں سے باہر ایک وسیع چار دیواری اور برآمدے سمیت دو کمروں مشتمل تھا۔ ابھی اس میں پلستر ہونا باقی تھا البتہ فرش پڑ چکے تھے اور بر آمدے میں کوئی ایک درجن آرام کرسیاں ایک قطار میں بچھی تھیں۔ مہمانوں کے قیام کے لیے اندر دو نواڑی پلنگ تھے اور صحن میں تین چارپائیاں تھیں جن پر فرمان علی اور اس کے دوست بیٹھے تھے۔ ایک چار پائی پر ڈن ہل' سگریٹوں کا بڑا پیکٹ اور چمک دار سگریٹ لائٹر رکھا تھا' ساتھ ہی ایک حقہ چل رہا تھا جسے تازہ رکھنے کی ذمہ داری جمعہ تیلی کے سپرد تھی۔

فرمان علی نے اب مونچھیں صاف کروا دی تھیں اور دیسی شلوار قمیض کے اوپر ولائتی وضع کی جیکٹ پہن رکھی تھی جس میں بٹنوں کی بجائے سنہری زپ (ZIP) لگی تھی۔ پاؤں میں سویڈ کے چپل اور گلے میں سونے کی زنجیر پہن رکھی تھی جس کیساتھ کوئی تعویذ بھی لٹکا ہوا تھا لیکن وہ جیکٹ کے اندر ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے ساتھی بھی ولائتی سویٹر' گھڑیاں اور انگوٹھیاں پہنے ہوئے تھے البتہ لمبو جو گاؤں میں رہتا تھا زیب و زینت سے عاری تہبند اور کرتے میں ملبوس تھا۔
میرے بیٹھتے ہی جمعہ تیلی نے حقے کی نال فوراً میری طرف گھما دی۔ میں نے معذرت کی تو فرمان علی نے کہا۔ "اوئے جمعے کے بچے! اباؤ جی حقہ نہیں پیتے وہ امریکی سگریٹ پیش کر۔" پھر خود ہی ڈن ہل کا پیکٹ کھول کر مجھے سگریٹ پیش کیا لیکن میں نے اس سے بھی معذرت کرلی۔ پھر اس نے پوچھا۔ "تو باؤ جی! کیا پیو گے' چائے' کافی یا کولڈ ڈرنک؟" کسی چیز کی حاجت نہیں ابھی ناشتہ کرکے آیا ہوں۔"
"نہیں بادشاہو' کچھ نہ کچھ تو پینا پڑے گا' پہلی دفعہ ملک فرمان علی کے ڈیرے پر آئے ہو۔
میں نے پھر نہ کی تو اس نے زبردستی جمعہ تیلی کو اندر والے مکان میں یہ کہہ کر بھیج

دیا کہ جا سکوائش وغیرہ بنوالا' موسم کچھ کھل گیا ہے۔ جمعہ تیلی "جی ملک صاحب" کہہ کر روانہ ہو گیا اور حقے کی نال لبو نے سنبھال لی۔

"باؤ امجد آجکل کیا شغل ہے؟"

"شہر میں ہوتا ہوں ایک دفتر میں کام کرتا ہوں۔"

"کتنی تنخواہ ملتی ہے؟"

"سولہ سو روپے!"

"ہر ہفتے؟"

"نہیں ہر مہینے...... پاکستان میں تنخواہیں ہر ہفتے نہیں' ہر مہینے ملتی ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے امجد باؤ' لیکن یہ ظلم نہیں ہے؟ اتنی تنخواہ تو مجھ جیسا ان پڑھ مزدور کویت میں ایک ہفتے میں کما لیتا ہے۔ آپ نے تو بہت ساری جماعتیں پڑھی تھیں۔ کتنی تھیں بھلا؟"

"سولہ جماعتیں!"

"توبہ توبہ' سولہ جماعتیں اور مہینے کا صرف سولہ سو روپیہ! یہ تو ایک سو روپیہ فی جماعت ہی پڑا اور وہ بھی مہینے کے بعد' ڈیلی ویجز تو پھر بہت کم بنتی ہو گی۔ کیوں یونس! تجھے کتنی ویجز ملتی ہے ڈیلی؟"

"کوئی سو روپے بن جاتی ہے اوور ٹائم لگا کر۔"

پھر فرمان علی نے گفتگو کا رخ میری طرف موڑا اور بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "جی باؤ جی! باہر کیوں نہیں چلے جاتے؟ بڑی تنخواہیں ہیں! بڑی بڑی تنخواہیں۔"

"نہیں میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔"

"سوچ لو بادشاہو! ادھر ہماری کوپنی میں ایک بابو ہے جو صرف گیٹ پر بیٹھا یہ لکھتا رہتا ہے کہ بلڈنگ پر خرچے کے لیے کتنا مال آیا ہے' وہ چار ہزار روپے لیتا ہے ہر مہینے! بس دو چار سال لگا آؤ' ملک جابر علی سے بڑی حویلی بنا لو گے!"

"میری چھوڑو' اپنی سناؤ۔ ساری عمر کمائی ہی کرتے رہو گے یا شادی وادی بھی کرو گے؟"

"شادی میں کیا جلدی ہے' شادیوں کے لیے حویلی والے ملک صاحب کیا کم ہیں۔ سنا ہے تیسری شادی کی سوچ رہے ہیں۔ میں تو شادی سے پہلے ایک کام کرنا چاہتا ہوں....."

"وہ کیا؟"

"بس کچھ نہ پوچھو' ایک خفیہ منصوبہ ہے' زبردست۔ بتاؤں گا کسی وقت۔"

"بتانا ہے تو ابھی بتاؤ' پھر پتہ نہیں تم کب آؤ گے اور اس وقت میں کہاں ہوں گا۔"

"منصوبہ یہ ہے ------- اور بے شک ملک جابر علی کو بتا دینا کہ -------"

"میرا کام ادھر باتیں ادھر پہنچانا نہیں۔ یہ کام کسی اور کے سپرد کرنا' تم منصوبہ بتانا چاہتے تو ضرور بتاؤ۔"

"منصوبہ ہے ملک جابر علی کو اس کی عیاشی کا مزہ چکھانا۔"

"کیوں؟"

"بس ایسے ہی! جب سے میں پیدا ہوا ہوں' یہی سنتا آیا ہوں کہ گاؤں کے مشرق طرف نہ جانا' ملک صاحب کی حویلی پڑتی ہے۔ شمال کی طرف نہ جانا' ادھر ان کے باغ ہیں۔ جنوب کی طرف نہ جانا' ادھر ان کے مربعے ہیں۔ کیا غریبوں کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی؟ غریب کہاں جائیں......"

"لیکن مغربی جانب تو جانے کی پوری آزادی ہے!"

"جی ہاں' ادھر قبرستان پڑتا ہے نا اس لئے۔"

"لیکن بھائی فرمان!"

"بھائی فرمان نہیں' ملک فرمان علی کہو کیونکہ میں حویلی والوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہاں کوئی اور ملک بھی رہتا ہے۔ ان کی نسل کا۔ آج کل نہیں' سو دو سو سال پرانی نسل کا! انھوں نے انگریزوں کے خوشامد کر کے مربعے کیا حاصل کر لئے' ہم سے رشتہ ہی توڑ لیا۔ ہمیں بھی ایسے رشتوں کی ضرورت نہیں۔ لیکن میں انہیں بتا دوں گا کہ چوٹ برابر کی ہے' ملک جابر علی اور ملک فرمان علی کے درمیان۔ بس دو سال بعد جب

چھٹی پر آؤں گا پورا بندوبست کر کے آؤں گا۔"
اتنے میں بابا میراں بخش بھی کھیس کی بکل مارے آ گیا اور اس نے فرمان علی کی دھمکی

کا آخری حصہ سن لیا۔ اس نے گیٹ میں داخل ہوتے ہی کہا۔
"امجد پتر! تو سمجھا ان ڈنگروں کو یہ کس سے ٹکر لینے کی تیاریاں کر رہے ہیں' ملک جابر علی کی طاقت کا انہیں اندازہ نہیں وہ تو پھونک مارے تو پورا گاؤں اڑ جائے۔ اس کے پاس بہت طاقت ہے' بہت طاقت!"
فرمان علی بولا۔ "ہم دیکھ لیں گے اس کی طاقت کو! ہم بتا دیں گے اسے کہ طاقت دولت میں نہیں ہوتی' انسانوں میں ہوتی ہے۔ ہم نے ورزشیں کر کر کے جانیں یونہی نہیں بنائیں! اگلی چھٹی پر آؤں گا تو اپنے سب دوستوں کو چٹھیاں لکھ کر آؤں گا کہ فلاں تاریخ کو پہنچ جاؤ' دنگل پڑنے والا ہے۔ کروڑ پتی جابر علی اور کویت میں مزدوری کرنے والے فرمان علی کا! وہ لے آئے اپنے گھبرو بیٹے اور کرائے کے ٹٹو اور ہم بھی لے آئیں گے جو کچھ ہمارے پاس ہے' اور ہو جائے فیصلہ ہمیشہ کے لیے کون بڑا ہے اور کون چھوٹا.... اگر اسے یہاں رہنا ہے تو برابری کی سطح پر رہے' بھائی بن کر رہے' ملکوں کا بجن ملک بن کر رہے اور اگر اس نے اونچے شملے' لمبی کاروں' ایئر کنڈیشنڈ کمروں اور کروڑوں کے بینک بیلنس کے بل بوتے پر ہم پر دھونس جمانے کی کوشش کی تو ہم کھا جائیں گے..... کچا چبا جائیں گے۔"
میراں بخش: "کیا فضول بحث چھیڑ دی ہے تو نے' آیا بڑا کچا چبانے والا!"
فرمان علی: "غیرت حویلی والوں کی موروثی جائیداد نہیں' ہم بھی غیرت والے ہیں۔"
"اچھا بیٹا اچھا' دو سال بعد آؤ گے تو دیکھا جائے گا۔ میں تو مسجد سے واپس گھر جاتے ہوئے یہ پوچھنے آ گیا تھا کہ روٹی کھانے گھر آؤ گے یا جمعے تیلی کے ہاتھ سب کا کھانا یہاں بھجوا دوں۔"
فرمان علی: "یہیں بھجوا دیں...ہم پانچ آدمی ہیں' بابو امجد سمیت۔"
"اچھا بیٹا' اچھا!" یہ کہہ کر میراں بخش چل دیا۔

ملک جابر علی کا اپاہج بیٹا صوفی شعیب اپنی فالج زدہ ٹانگوں کو سکیڑے ایک چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا جس پر فوم کا گدا اور خوبصورت پھولوں والی چادر بچھی ہوئی تھی' سرہانے گول تکیہ رکھا تھا اور پائنتی کی طرف شعیب کی بیساکھیاں دھری تھیں۔ پلنگ کے پاس دفتری وضع کی تین کرسیاں بچھی تھیں جن میں سے ایک پر بڑے بڑے رجسٹر پڑے تھے۔

شعیب نے حسب معمول سفید شلوار کرتہ پہن رکھا تھا اور اس کے ماتھے پر سجدہ ریزی کا واضح نشان نظر آرہا تھا اور اس کی کالی ڈاڑھی میں سے کئی سفید بال چاندی کے تاروں کی طرح جھلملا رہے تھے۔ آج خلاف معمول اس نے سفید کپڑے کی دو پلی ٹوپی سر پر پہن رکھی تھی اور گردن سینے کی طرف جھکائے تسبیح پھیر رہا تھا' شاید وہ کھاتے چیک کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ میں نے کہا۔ "شانتی نگر کا ماحول کچھ بدلا بدلا نظر آتا ہے۔"

"ہاں' آپ نے ٹھیک فرمایا' فضا کچھ ٹھیک نہیں رہی"

"یہی میں عرض کر رہا تھا کہ ملک صاحب نے ایک وسیع القلب شخص کی طرح غریبوں کی بہت مدد کی ہے۔ اپنے بیٹوں' بیویوں بہوؤں پر بہت خرچ کرتے ہیں لیکن جس کا دل ٹٹولو' اندر سے کچھ اور ہی قسم کی گھنٹیاں بجتی ہیں۔"

"ہاں' حویلی کے اندر تو یہی فضا ہے کہ ایک بہو پچیس ہزار روپے کی شاپنگ کرکے آتی ہے اور دوسرے دن گلہ کرنے بیٹھ جاتی ہے کہ ہمارے لئے اس حویلی میں کیا دھرا ہے' یہ تو سب کچھ ملک صاحب کی مٹھی میں ہے۔ ایک بیگم غیر ملکی سیاحت سے واپس آتی ہیں تو ہفتہ بھر نہیں گذرنے پاتا کہ شکایت کرنے لگتی ہیں کہ اس حویلی میں میری کوئی نہیں سنتا' کتنی خوش نصیب ہیں وہ عورتیں جو اپنے گھروں میں حکمرانی کرتی ہیں....."

"اور یہی حال کچھ کچھ گاؤں والوں کا بھی ہے!"

"وہ کیسے؟"

"بس خدا واسطے کا بیر' خواہ مخواہ کی نفرت' کسی کو پھلتے پھولتے دیکھ نہیں سکتے۔ دوبئی' کویت اور لندن کا پیسہ کیا آیا ہے' فتور آگیا ہے ان کے دماغ میں کہتے ہیں ہم ملک صاحب کو نیچا دکھا کر رہیں گے' ان کا شملہ نیچا کرکے دم لیں گے...... آخر اس کی کیا وجہ ہے؟"

"میرے خیال میں ملک صاحب سے حقوق العباد ادا کرنے میں کوتاہی ہوئی ہے۔ انہوں نے لوگوں کو پیسہ' آرام اور سکون تو دیا ہے' عزت نفس نہیں دی اور لوگ عزت نفس کو آج کل ہر چیز پر مقدم سمجھتے ہیں' کیا خیال ہے آپ کا؟"

"میں آپ سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ تصادم اور خون خرابے کی نوبت نہ آئے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے' تلخیاں مٹ جائیں' حویلی والوں اور گاؤں والوں کے ایک دوسرے سے گلے شکوے دور ہو جائیں۔ شانتی نگر دو حصوں میں بٹنے کی بجائے ایک شانتی نگر بن جائے......."

"آمین!"

فرمان علی کا دو سالہ منصوبہ ابھی دور تھا۔ فی الحال وہ چھٹی کاٹ کر پھر اینٹیں ڈھونے کویت چلا گیا۔ اس کے چند ماہ بعد عیدالفطر تھی اور حسب معمول گاؤں کے بہت سے نوجوان غیر ممالک سے چھٹی لے کر عید منانے گاؤں چلے آئے۔ کسی کی چھٹی دو ہفتے کی تھی' کسی کی ایک ماہ کی لیکن بوٹا خان دو ماہ کی رخصت لے آیا تھا کیونکہ اس نے چوبارا تعمیر کروانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔

یہ نوجوان رات کو تو اپنے اپنے گھر میں سوتے لیکن سارا دن اسحاق اور فرمان علی کے مشترکہ ڈیرے پر گذارتے جہاں ہر وقت چھ سات چارپائیاں اور دس بارہ کرسیاں بچھی رہتی تھیں۔ گاؤں کا کوئی نہ کوئی کمین' جمعہ تیلی یا پھُو موچی حقہ تازہ رکھنے اور مہمانوں کی تواضع کے لیے موجودہ رہتا تھا۔ کئی نوجوان' سکول کے لڑکے یا دوسرے تماشائی بھی وہاں جمع ہو جاتے تھے۔

وہ عید پڑھ کر اسی ڈیرے میں جمع ہوگئے انہوں نے رنگ برنگ کے کپڑے' غیر ملکی گھڑیاں اور (بعض نے) گلے میں سنہری زنجیریں پہن رکھی تھیں۔ اسحاق نے گول گلے والی سرخ رنگ کی بنیان پہن رکھی تھی جو اس کی قمیض کے گریبان سے باہر نظر آ رہی تھی۔ بوٹا خان نے چھاتی والی جیب میں بٹوا ٹھونس رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کی قمیض کا بایاں حصہ بہت لٹک گیا تھا۔ منیر (سابق منیرا) اپنی چمکیلی گھڑی' رنگین رومال اور صاف ستھرے جوڑے میں بڑا معزز لگ رہا تھا۔ یونس کالیا نے گلے میں سنہری زنجیر کے ساتھ تعویذ لٹکا رکھا تھا اور آج اس نے اسے قمیض کے اندر چھپانے کی بجائے سویٹر کے اوپر ڈال رکھا تھا۔ کئی ایک نے شوقیہ طور پر بغل میں پستول لٹکا رکھے تھے۔

صحن میں ایک طرف میز پر چار بینڈ والا نیشنل ٹرانسسٹر ٹیپ ریکارڈر تھا جس کے ساتھ ستے فلمی گانوں کے چھ سات کیسٹ پڑے تھے۔ اسحاق نے ریڈیو لگانے کی بجائے اس میں ایک کیسٹ لگا کر اسے "آن" کر دیا۔ نور جہاں کی آواز گونجنے لگی۔ اس نے والیوم اونچا کر دیا تاکہ آواز اور بلند ہو جائے۔ جب پورے والیوم پر بھی اس کی تسلی نہ ہوئی تو اس نے پھٹو موچی کو حکم دیا کہ وہ ملک الیکٹرک اسٹور سے دو ایمپلی فائر لے آئے۔ پھٹو تو تعمیل حکم کے لیے فوراً روانہ ہو گیا لیکن بوٹا خان نے پوچھا! "اسحاق یار! کیوں کان پھاڑنا چاہتے ہو ہمارے' آواز کافی ہے۔"

اس نے جواب دیا۔ "ہمارے لئے تو کافی ہے لیکن میں ذرا ملک جابر علی کو بھی نور جہاں کے نغمے سنانا چاہتا ہوں۔" اس پر ساری محفل میں قہقہہ اٹھا' تالیاں بجیں ایک دو نے کہا "گڈ' ویری گڈ"

پھٹو ایمپلی فائر لے آیا تو اسحاق نے ٹرانسسٹر ٹیپ ریکارڈر سے اس کی تاریں جوڑ دیں اور نور جہاں پورے زور و شور سے چلانے لگی۔ جب وہ کیسٹ ختم ہو گیا تو اسحاق گلوکار شوکت کا گانا لگا دیا۔ گانا تو ایسا اچھا نہ تھا لیکن شوکت علی کی آواز اتنی اونچی تھی کہ ملک جابر علی کے کانوں میں کھلبلی مچا سکتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد بابا میراں بخش بھی ڈیرے پر آ گیا۔ سب بیٹوں' بھتیجوں اور مہمانوں سے ملا۔ اسے کرسی پر بٹھا کر حقہ پیش کیا گیا۔ بابا میراں بخش جو صلح جو اور خاموش طبیعت کا مالک تھا' اس ہنگامے سے خوش نہ ہوا۔ اس نے کہا۔ "پتر اس کی آواز آہستہ کر دو میرے تو پلے کچھ نہیں پڑ رہا کہ یہ کیا گا رہا ہے۔" لڑکوں نے اپنی اصلی شرارت کو پوشیدہ رکھتے ہوئے کہا۔

"بابا جی' آج عید ہے' ملے گلے کا دن ہے۔"

"ٹھیک ہے بیٹا! خوشی مناؤ' ضرور مناؤ' لیکن شور تو نہ مچاؤ!"

اسحاق نے کہا۔ "ابا جان! بہت عرصے کے بعد چار یار اکٹھے ہوئے ہیں' ذرا رونق میلہ ہو جائے۔ ہم کسی کا کیا بگاڑ رہے ہیں؟"

"اچھا پترو تمہاری مرضی!"

اس کے بعد بابا میراں بخش حقے کے کش لگانے لگا اور نوجوان اپنی خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔ کیسٹ بجتا رہا۔ شوکت علی چپ ہوا تو سائیں اختر لگا دیا گیا کیونکہ اس کی آواز بھی بہت اونچی تھی۔

تھوڑی دیر بعد پھاٹک پر کسی نے دستک دی جو اس شور میں اندر سنائی نہ دی۔ دستک دینے والے نے لاٹھی کے ساتھ ٹین کا گیٹ کھٹکھٹایا تو اسحاق نے کہا۔ "اوئے کیہڑا اے! آجا' آجا اندر کونسی عورتیں بیٹھی ہیں!" لیکن پھر بھی کوئی شخص اندر نہ آیا بلکہ اس نے پھر لاٹھی سے گیٹ کھٹکھٹایا۔

اسحاق نے کہا۔ "پٹھو! اوئے' جا ذرا دیکھ تو سہی یہ کوئی نرالا مہمان آ گیا ہے جو اندر ہی نہیں آ رہا!"

پٹھو دروازے پر گیا اور واپس آ کر کہنے لگا۔

"ملک جابر کا نوکر احمد خان ہے۔ پوچھ رہا ہے کیا بابا میراں بخش یہاں ہے؟"

"کیوں؟"

"کہہ رہا ہے' اسے ملک صاحب نے حویلی میں بلایا ہے۔"

میراں بخش یہ سن کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اسحاق نے پکڑ کر اسے دوبارہ کرسی پر بٹھا دیا اور ٹرانسسٹر ٹیپ ریکارڈر کی آواز بند کرکے کہا۔

"ابا جی! آپ نہیں جائیں گے حویلی میں۔ ساری عمر چھوٹی چھوٹی باتوں پر پیشیاں بھگت بھگت کر آپ بڈھے ہو گئے ہیں۔ آپ یہاں عزت کے ساتھ بیٹھیں۔ اگر ملک صاحب کو کوئی شکایت ہے تو انہیں یہاں آنا پڑے گا۔ ہم نپٹ لیں گے ان سے!"

"نہیں بیٹا' مجھے جانے دو' کسی کی بات سن لینے میں کوئی حرج نہیں۔"

"بہت حرج ہے' ہم چل کر کسی کے در پر کیوں جائیں؟"

"کوئی بات نہیں' چل کر جانے سے انسان چھوٹا نہیں ہو جاتا۔"

باپ بیٹے کی یہ گفتگو جاری تھی کہ بوٹا خان نے زور سے احمد خان کو مخاطب کر کے کہا۔ "جا' جا ملک صاحب کو بتا دے کہ بابا میراں بخش نہیں آئے گا۔ اگر ملک صاحب کو کوئی شکایت ہے تو ڈیرے پر آ جائیں' ہم ان کی ساری شکایتیں دور کر دیں گے۔"

ملک صاحب کا ایلچی دروازے ہی سے واپس چلا گیا اور بابا میراں بخش سفید چادر کی بکل مارے' حقے کی نال مٹھی میں لے کر سوچ میں محو ہو گیا۔ لڑکے اپنے کھیل تماشے میں لگ گئے۔

تھوڑی دیر بعد اس ہلے گلے کے موڈ میں منیر نے پستول خول سے نکالا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ' ہوا میں فائر کر دیا۔ دوسرے کب پیچھے رہنے والے تھے' انہوں نے بھی ایک ایک ہوائی فائر کر دیا۔ اسحاق خان نے انہیں روکا اور کہا۔ "ٹھہرو' ٹھہرو' شکاریو ابھی پتہ چل جاتا ہے تمہارے نشانے کا! ادھر برآمدے میں لائن بنا کر کھڑے ہو جاؤ۔ پھاٹک کے ساتھ والا ستون تمہارا ٹارگٹ ہے۔ فائر کا آرڈر میں دوں گا۔ باری باری سب فائر کریں گے۔ پھر دیکھتے ہیں کس کا نشانہ ٹھیک لگتا ہے۔" ہجوم میں سے فوراً ایک نعرہ بلند ہوا۔ "ٹھیک ہے' لالہ اسحاق کی تجویز ٹھیک ہے۔" چنانچہ یونس' منیر اور بھا بشیر صف باندھ کر کھڑے ہوگئے۔ گیٹ اندر سے بند کر دیا گیا تاکہ کوئی شخص اچانک داخل ہونے سے زخمی نہ ہو جائے۔ تماشائی صحن میں ایک طرف کھڑے ہو کر بڑے اشتیاق سے

یہ مقابلہ دیکھنے لگے۔ اسحاق کے آرڈر پر پہلے منیر نے فائر کیا پھر یونس نے اور آخر میں بھا بشیر نے۔ پھر سب دوڑ کر ٹارگٹ کے پاس گئے جہاں پکی اینٹوں پر چھوٹے چھوٹے تین سوراخ ہو گئے تھے۔ ہر ایک نے نشانہ ٹارگٹ پر لگنے کی خوشی منائی' تالیاں بجائیں۔

گاؤں میں چند "ولایتی" مہمان اور بھی آئے تھے۔ انہوں نے ضد میں آ کر یا یونہی ہلے گلے میں شرکت کے لیے رائفل سے دو چار ہوائی فائر کر دیئے۔ رائفل کی گولیاں سنسناتی ہوئی گزر گئیں۔ ڈیرے پر موجود حاضرین لمحے بھر کو سہمے اور پھر گولیوں کے پیچھے مانوس قہقہے سن کر تالیاں بجانے لگے۔ پھٹو موچی نے کہا' ضرور ملک فتح محمد کا بیٹا صغیر ہو گا جس نے تازہ تازہ رفل خریدی ہے۔ اسحاق نے کہا دوسرا فائر تو دونالی بندوق کا لگتا ہے۔ پھٹو نے پھر لقمہ دیا۔ "جی ملک فتح محمد کے پاس اپنی دونالی بندوق بھی ہے۔ تین چار سال پہلے خریدی تھی انہوں نے۔"

ادھر حویلی کے مالک' ملک جابر علی کا رد عمل بالکل مختلف تھا۔ وہ سمجھے کہ یہ سارے فائر ان کی حویلی پر کیے گئے ہیں۔ آج تک شانتی نگر میں صرف ملک صاحب کی گولیاں گونجی تھیں۔ آج پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ کسی اور نے' ان کی اجازت کے بغیر اس علاقے میں فائر کیا۔ یہاں تو صرف انہی کا غلبہ اور انہی کی حاکمیت تھی۔ انہیں یوں محسوس ہوا کہ گولیوں کی سنسناہٹ نے ان کی حکمرانی کی چادر میں چھید کر دیئے ہیں۔ انہوں نے فوراً اپنے ملازموں پھتے' کرمے' قاسم' نورے اور رحمان کو بلایا۔ انہیں گولیوں کے پٹے سمیت ایک ایک رائفل تھمائی اور کہا۔

"میری زندگی میں اور اس حویلی کی تاریخ میں یہ پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ اس پر کسی نے دن دہاڑے گولیاں چلائی ہیں۔ میرے جیتے جی میری اتھارٹی کو چیلنج کیا گیا ہے۔ تم لوگوں کو کس وقت کے لیے پال رکھا ہے' جاؤ اور ان گولیاں چلانے والوں کو خاموش کر دو۔ آگے میں سنبھال لوں گا' تم فکر مت کرو۔ جاؤ!"

ملازموں نے تقریباً یک زبان ہو کر کہا۔ "جی حضور" اور رائفلیں اور گولیاں لے کر حویلی

سے باہر نکل گئے۔

کرائے کے محافظ اپنے مالک کے سامنے جتنے بہادر اور وفادار لگتے ہیں غالباً اس کے پیٹھ پیچھے اتنے جاں نثار نہیں ہوتے' چنانچہ ہتھیار بند ملازموں کا یہ جتھہ بھی بڑے زور و شور سے حویلی سے نکلا لیکن باہر آ کر سوچ میں پڑ گیا کہ وہ کس مجرم کو تلاش کریں' کس پر گولی چلائیں۔ اور اگر انہوں نے کسی معصوم پر ہاتھ اٹھایا یا گولی چلائی تو پھر کیا ہو گا؟ وہ یہی سوچتے سوچتے اس راستے پر آ گئے جو حویلی اور گاؤں کے درمیان حد فاصل کا کام دیتا تھا۔ ان کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ اندھا دھند گولیاں چلا کر کسی قسم کا خطرہ مول لیں لہٰذا اسی بارڈر پر رک گئے۔ ان میں سے پھتہ بولا "کیوں کرمے' کیہ کرنا ایں فیر؟" کرما جو خود تذبذب میں تھا' کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ وہ نورے کا منہ دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر تک انہوں نے آپس میں سرگوشیاں کیں اور اس فیصلے پر پہنچے کہ گاؤں میں داخل ہونے کی بجائے وہیں کھڑے ہوائی فائر کا جواب ہوائی فائر سے دے کر واپس چلے جائیں' چنانچہ سب سے پہلے پھتے نے ایک ہوائی فائر کیا' چند لمحے رد عمل کا انتظار کیا' کچھ نہ ہوا تو کرمے نے گولی چلا دی' پھر ذرا سا وقفہ دے کر دوسرے دو نوکروں نے بھی اپنا فرض ادا کرنے کے لیے لبلبی دبا دی۔

تھوڑی دیر بعد گاؤں والے بھی جوابی کارروائی کے لیے ہتھیار لے کر نکل آئے اور سرحد کے مغربی جانب صف آراء ہو گئے۔ یوں لگتا تھا کہ آج لاوا پھٹ پڑے گا اور عید جیسے خوشی کے موقع پر شانتی نگر کے دو حصوں کے درمیان خون خرابا ہو جائے گا۔

بابا بہشتی جو آدھ گھنٹہ پہلے گاؤں سے شوقیہ فائر کی آواز سن چکا تھا' بیتاب ہو کر اپنی جھگی سے نکل پڑا۔ اس کی زندگی میں بھی یہ پہلی مرتبہ ہوا کہ گاؤں میں پے در پے فائر کئے گئے تھے۔ اسے حویلی اور گاؤں کی آویزش کا خیال نہ تھا' وہ تو فائر کی آواز کو تباہی کا نقیب سمجھا اور تباہی کو روکنے کے لیے حسب معمول دوڑ پڑا۔ جب وہ گاؤں کے قریب پہنچا تو محاذ آرائی عروج پر تھی۔ بابا بہشتی نے آتے ہی شور مچانا شروع کر

دیا۔ "رک جاؤ' رک جاؤ! چھوڑ دو ہتھیار ہٹ جاؤ ایک دوسرے کے سامنے سے۔ چھوڑ دو یہ جھگڑا۔" لوگ بابا بہشتی کو گرد آلود کپڑوں سفید ڈاڑھی اور ننگے پاؤں دیکھ کر حیران تو ضرور ہوئے اور توجہ اور حیرت سے اس کی طرف دیکھنے بھی لگے لیکن اس بے ضرر اور بے اثر بڈھے کے کہنے پر وہ اپنی جگہ سے ہٹنے کو تیار نہ تھے۔ جب انہوں نے فائر کرنے کے لیے رائفلیں سیدھی کیں تو بابا بہشتی گرتا پڑتا دونوں صفوں کے درمیان جا کھڑا ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر پھر فریاد کرنا شروع کردی۔

"رک جاؤ' ہٹ جاؤ رائفلیں نیچے کرلو!" بابا بہشتی کو عین درمیان میں پا کر دونوں ٹیمیں رک گئیں۔ اتنے میں گاؤں سے بابا میراں بخش' بابا کلو اور دوسرے بزرگ نکل آئے اور بات رفع دفع ہو گئی۔ ملک جابر علی کے ملازم تو خیر اس تاک میں تھے کہ ٹکراؤ کے بغیر ہی واپس جانے کا کوئی بہانہ مل جائے البتہ اسحاق' فرمان علی' یونس' منیرا اور بھا بشیر غصے سے کھول رہے تھے ان کی آنکھوں اور نتھنوں سے انتقام کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ وہ سچ مچ مرنے مارنے کو تیار تھے لیکن اللہ تعالٰی کے فضل و کرم اور بابا بہشتی کی بر وقت مداخلت سے معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

ملک صاحب کا چھوٹا بیٹا ضمیر ایک مہینے سے شہر گیا ہوا تھا حویلی والوں کا خیال تھا کہ وہ ذہنی عیاشی کے لئے وہاں کالجوں' لائبریریوں اور کتب خانوں کے چکر لگا رہا ہے جبکہ گاؤں والے جو حویلی سے متعلق ہر شے میں کیڑے نکالتے تھے' پروپیگنڈہ کرتے تھے کہ اس نے وہاں ایک کوٹھی کرائے پر لے کر جسمانی عیاشی کا اڈہ بنا رکھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ شادی پر بھی رضا مند نہیں ہوا۔

ایک دن وہ بابا بہشتی کے ڈیرے سے واپس آرہا تھا تو اچانک اس سے ملاقات ہوئی اس نے حسب معمول شلوار کرتہ پہن رکھا تھا گرمیوں کے باوجود چادر بغل سے نکال کر کندھے پر ڈال رکھی تھی' پائپ کبھی منہ میں اور کبھی دائیں ہاتھ میں ہوتا تھا جبکہ قیمتی تمباکو کا ڈبہ بائیں ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ اس نے حسب معمول صاف شیو بنا رکھی تھی اور

متواتر تمباکو نوشی کے باعث اس کے ہونٹوں کا رنگ کچھ کچھ بدل چکا تھا یعنی کے ہونٹ اس کے گورے چہرے کی طرح گورے اور ترو تازہ نہ تھے بلکہ ذرا خشک' کچھ زرد زرد!

اس وقت سورج ڈوبنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اس نے شعاعوں کی تمازت کمزور پڑ چکی تھی او ڈوبتے سورج کی سنہری کرنیں حویلی کے کلس کو بڑے دلاویز رنگ میں رنگ رہی تھیں۔ میں نے ضمیر کے دانشورانہ ذہن میں چٹکی لینے کی غرض سے کہا۔

"ضمیر صاحب! یہ ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں ہیں لیکن اب بھی سورج سے آنکھ ملانے کی کوشش کریں تو اس کی شعاعیں آنکھیں چندھیا دیتی ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ طاقتور سورج جب رخصت ہو رہا ہوتا ہے تو اس وقت بھی اجازت نہیں دیتا کہ دن بھر اس کی دھوپ سہنے والا کوئی شخص اس سے آنکھیں چار کر سکے۔"

ضمیر نے جواب دیا۔

"یہ سورج کل پھر طلوع ہو گا اور ان شعاعوں سے کہیں زیادہ طاقتور شعاعوں کے نیزے اور اپنے ترکش میں بھر کر لائے گا۔"

"نہیں! ڈوبا ہوا سورج کبھی طلوع نہیں ہوتا کل طلوع ہونے والا سورج اور ہو گا وہ اپنی جاہ و حشمت دکھانے کے لئے اپنا نیا ترکش لے کر آئے گا۔"

"ہاں لیکن اس کی عمر بھی صرف ایک دن ہو گی۔ صرف ایک دن! بالاخر اس کا مقدر بھی رات ہو گی۔"

"لیکن جب تک وہ عروج پر رہے گا وہ کبھی نہیں سمجھے گا کہ چند گھنٹے بعد ڈائن رات اسے ہڑپ کر جائے گی۔"

"اگر اتنی دور اندیشی آ جاتی لوگوں میں' تو انسانیت اتنی مجبور و بے کس نہ ہوتی۔"

یہ جملہ کہتے ہی ضمیر نے حویلی کے کلس کی چوٹی کی طرف دیکھا جو زریں شعاعوں میں نہا رہی تھی اس نے اسی فلسفیانہ موڈ میں کہا۔

"لیکن یہ اسی سورج کا کمال ہے کہ اس نے حویلی کے میلے کچیلے کلس کو اپنی کرنوں

سے اتنا دلکش بنا دیا ہے۔"

میں نے کہا "یہی تو گلہ ہے۔ آپ تو ہمیشہ حویلی کے زاویے سے ہر چیز کو دیکھتے ہیں۔"

ضمیر نے ایک لمبا سانس لیا جیب سے قیمتی پائپ نکالا' اسے لوہے کی ایک خوبصورت سلاخ سے صاف کیا پھر پائپ کو الٹا کر اپنے چپل کے مضبوط سول سے ٹکرایا تا کہ پائپ کے اندر کا کھرچا ہوا تمباکو باہر آ جائے۔ پائپ خالی ہو گیا تو اس نے نیا تمباکو بھرنا شروع کر دیا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا بابا بہشتی کے ڈیرے سے آ رہے ہیں؟"

"ہاں"

شہر سے کب آئے؟"

"کل شام"

"کیسا رہا؟"

"کیا"

"شہر میں قیام!"

"بیرن (BARREN) اس شہر کی کوئی انٹیلکچوئیل لائف نہیں۔ چند ایک لیکچرار ہیں جنہیں اپنی نوکری اور ٹیوشن پڑھانے سے فرصت نہیں۔ ان کی کوئی AMBITIONS INTELLECTUAL نہیں ہیں بالکل بیرن! شانتی نگر کی بارانی زمینوں کی طرح کالج کی لائبریری پر تالے پڑے ہیں اور کتابوں پر گرد کوئی کتاب جھاڑ پھونک کر نکالو تو سن اشاعت دوسری جنگ عظیم یا اس سے پہلے کا ملے گا۔ دنیا کتنی آگے جا چکی ہے اور ان کی گھڑی کی سوئیاں وہیں کی وہیں اٹکی ہوئی ہے یہ یہی حال کتبہ فروشوں کا ہے وہ صرف کتابیں اور سٹیشنری وغیرہ دکان پر رکھتے ہیں جن سے انہیں فوراً منافع مل جائے کوئی تازہ کتاب امپورٹ نہیں کرتے۔ وہ بیچارے بھی سچے ہیں کہتے ہیں امپورٹڈ بکس کی قیمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ کوئی خریدتا ہی نہیں۔ برسوں پہلے پریذیڈنٹ آئزن ہاور کی سوانح حیات منگوائی تھی آج تک وہیں شیلف پر پڑی ہے۔"

"پھر؟"
"پھر کیا' واپس حویلی میں آتا ہوں تو یہ شہر سے بھی زیادہ بیرن (بنجر) لگتی ہے۔ ہر کسی کو دولت کمانے اور دولت خرچ کرنے کا جنون ہے گویا انسان پیدا ہی اسکے لئے ہوا تھا۔ حویلی میں کوئی چیز CREATIVE نہیں ہے اس میں حقیقی اور تخلیقی زندگی کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ مجھے تو حویلی کے سجے ہوئے کمرے سجی ہوئی قبریں لگتی ہیں جن کے مردے صبح سویرے اٹھ کر روبوٹ کی طرح کھیتوں اور فیکٹریوں میں روپیہ پیسہ اکٹھا کرنے کے لئے پھیل جاتے ہیں اور رات کو پھر مردوں کی طرح اپنی سجی سجائی قبروں میں لیٹ جاتے ہیں۔"
"پھر"
"پھر کیا' لے دے کر بابا بہشتی کا ڈیرہ رہ گیا ہے جہاں مجھے کچھ زندگی یا انسانیت نظر آتی ہے۔"
"بابا بہشتی نے آپ کو تازہ واقعہ نہیں بتایا"
"کونسا؟"
"وہی گاؤں اور حویلی کے تصادم کا"
"ہاں' سنایا اس نے"
"اس نے یہ بھی بتایا ہوگا کہ آخری وقت اس کی مداخلت نے صورت حال بدل دی اور خون خرابا ہونے سے رہ گیا۔"
"نہیں اس نے یہ تو نہیں بتایا۔ اس نے ساری کہانی بتائی اپنا وہاں جانا بھی بتایا لیکن اپنے رول کے بارے میں کچھ نہیں بتایا"
"بھئی اگر وہ دونوں طرف ہتھیار بند پارٹیوں کے درمیان اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اور بازو پھیلا کر کھڑا نہ ہو جاتا تو گولیاں چل جاتیں' خون کی ندیاں بہہ جاتیں۔"
"اچھا!"
"بھئی' بڑا عظیم آدمی ہے!"

"اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ اس آدمی میں ہے کچھ' آپ اس کی آنکھیں دیکھیں۔ ان میں بڑی عجیب روشنی نظر آتی ہے میں نے اتنے بڈھے شخص کی اتنی جوان آنکھیں کبھی نہیں دیکھیں۔ عجیب کیریکٹر ہے۔"

"تو ضمیر صاحب! کیا تبصرہ ہے آپ کا۔ گاؤں والوں کے رویے پر"

"تبصرہ کیا ہونا ہے امجد صاحب! انہیں پروٹسٹ کرنے کا حق ہے۔ وہ صدیوں کی غلامی سے جاگے ہیں' انہیں ہر کسی کو اپنے ہونے کا احساس دلانا ہے۔ میں تو اس بات کے لئے ذہنی طور پر تیار ہوں کہ جب صدیوں کا بندھا ہوا بند ٹوٹتا ہے تو رکا ہوا پانی غیر معمولی تیزی کے ساتھ بہتا ہے' عموماً طغیانی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ گاؤں والے جاگے تو ہیں لیکن وہ طغیانی نہیں بنے۔"

"اس دھارے کے سامنے آپ ملک صاحب کی پوزیشن کے متعلق کیا سوچتے ہیں؟"

"ملک صاحب جس نظام کو بلٹ پروف جیکٹ سمجھ کر سینے سے لگائے ہوئے ہیں وہ زنگ آلود اور کھوکھلا ہو چکا ہے' ذرا سی ٹھوکر سے اس کا انگ انگ جدا ہو جائے گا اور اس کے زنگ آلود اور کھوکھلے حصے گر پڑیں گے۔ جب انسان ڈوبنے لگے تو بلٹ پروف جیکٹ سمیت ڈوب جاتا ہے۔

"وہ آپ کے والد ہیں' آپ انہیں سمجھاتے نہیں؟"

"وہ عقل کل بنتے ہیں' انسانی دانش پر اجارہ داری کو اپنا حق سمجھتے ہیں' انہیں کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود اپنے انجام کو پہنچیں گے تو سمجھ آ جائے گی"

"لیکن ان کی بقا کے ساتھ تو حویلی کی بقا وابستہ ہے۔"

"یہ غلط فہمی ہے۔ ملک شجاعت علی بھی یہی سمجھتے رہے۔ ملک وجاہت علی بھی یہی سمجھتے تھے۔ ملک ہیبت علی بھی یہی سمجھتے رہے اور ملک جابر علی کو بھی غالباً یہی غلط فہمی ہے' لیکن مجھے اس میں ذرہ بھر شبہ نہیں کہ کوئی مرے کوئی جیئے' کوئی ڈوبے' کوئی بچے' حویلی انشاء اللہ قائم ہی رہے گی۔ اس کو کوئی نہ کوئی محافظ ضرور مل جائیگا۔"

در حقیقت ملک جابر علی کے اندر ایک نہیں' دو جابر علی تھے۔ ایک کو وہ اندر ہی اندر چھپائے رکھتے اور دوسرے کی نمائش کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ جس جابر علی کو وہ بڑھا چڑھا کر پیش کرتے' وہ یہ تھا کہ وہ پرانے خاندانی آدمی ہیں جن کے انگریز حکمرانوں کے ساتھ گہرے مراسم تھے اور وہ ان کے ساتھ تحائف اور خطوط کا تبادلہ کرتے تھے۔ اکٹھے دعوتیں اڑاتے تھے' سیریں کرتے تھے' شکار کھیلتے تھے اور جب انگریز چلے گئے تو ان کی جگہ.......... کم از کم شانتی نگر کی حد تک....... ملک جابر علی نے حکمرانی سنبھال لی تھی اور سارے معاملات انہی کی دانش' بصیرت اور پسند کے مطابق طے پاتے تھے۔ سارے علاقے میں ان کا کوئی حریف یا مد مقابل نہیں تھا اور وہ خود بڑے بہادر' دانا اور معاملہ فہم تھے۔

ملک صاحب کے اندر دوسرا جابر علی ایک بزدل' کوتاہ اندیش اور ہر وقت کانپنے والا شخص تھا جس نے زندگی میں نہتے انسانوں اور معصوم جانوروں پر تو کئی گولیاں چلائی تھیں لیکن خود کبھی گولی کا سامنا نہیں کیا تھا۔ گولی تو بڑی چیز ہے' کسی ڈنڈا بردار دشمن کا مقابلہ بھی نہیں کیا تھا۔ انہوں نے اپنے ظاہری ڈیل ڈول' زمیندارانہ ٹھاٹھ' برجس اور مونچھوں کی آن بان' سرکاری تعلقات اور بے زبان ملازموں کی فوج ظفر موج کے ذریعے اپنے اندر کے چھوٹے سے شخص کو چھپایا ہوا تھا۔ اب پتہ نہیں یہ زندگی کے آخری دور اور بڑھاپے کا نتیجہ تھا یا گاؤں کی بگڑتی ہوئی فضا کا اثر کہ ملک صاحب کے اندر کا بزدل اور خوف زدہ جابر علی کبھی کبھی بارعب اور حکمران جابر علی کے خول سے باہر جھانکنے لگا تھا۔

ایک دن سہ پہر کے وقت پرویز کا ایک دوست نعمان شیرازی اس سے ملنے آیا۔ پرویز اس وقت زمینوں پر تھا اور ملک صاحب ابھی ابھی باہر سے واپس آئے تھے۔ حویلی کے گیٹ کے پاس ان کی اتفاقاً ملاقات ہو گئی۔ علیک سلیک کے بعد جب تعارف ہوا تو ملک صاحب اسے ڈرائنگ روم میں لے گئے اور پرویز کے آنے تک اس کی مہمان نوازی کرنے لگے۔

ملک صاحب کی مہمان نوازی صرف کھلانے پلانے تک محدود نہ رہتی تھی بلکہ وہ اسے اس وقت تک مکمل نہیں سمجھتے تھے جب تک پرانے البم' خطوط اور میڈل وغیرہ دکھا کر مہمان کو اپنے عظیم ماضی سے آگاہ نہ کرلیں۔ اب وہ عمر کے ایسے حصے میں پہنچ چکے تھے جب انہیں یاد بھی نہیں رہتا تھا کہ کس مہمان کو عظمت کے یہ نشان وہ پہلے ہی دکھا چکے ہیں اور کس کو دکھانا باقی ہیں' اس لئے وہ ہر ملاقاتی کی ان چیزوں سے تواضع ضرور کرتے۔ شاید اس کی وجہ ان کے کمزور حافظے کی بجائے یہ نفسیاتی حقیقت تھی کہ انسان جب غریب ہونے لگے تو اپنی گذشتہ امارت کے قصے زیادہ بیان کرتا ہے' بوڑھا اور بد شکل ہو جائے تو اپنی جوانی اور حسن کی تصویریں دکھاتا ہے اور سماجی طور پر نیچے آنے لگے تو اپنے عظیم ماضی کا ذکر زیادہ کرنے لگتا ہے۔

نعمان شیرازی پرویز کا پرانا دوست تھا' حویلی میں کئی مرتبہ پہلے بھی آچکا تھا' ملک صاحب کو اچھی طرح جانتا تھا اور پندرہ بیس سال پہلے ملک صاحب کسی ایسے ہی موقع پر اس کی تواضع اسی انداز میں کر چکے تھے لیکن حویلی کے گیٹ پر جب ملک صاحب نے ایک اجنبی کے طور پر اس کا استقبال کیا اور ڈرائنگ روم میں اسے ایک اجنبی سمجھ کر خاندانی عظمت سے اسے آگاہ کرنا شروع کیا تو نعمان ایک سلجھے ہوئے شخص کی طرح پوری دلچسپی سے ان کی باتیں سننے لگا۔ اس نے ذرا ابھی یہ تاثر نہ دیا کہ وہ پہلے ہی یہ سب کچھ جانتا ہے اور اب کئی بار سنی ہوئی داستان سن رہا ہے۔ وہ بڑے صبرو تحمل سے سنتا رہا اور ملک صاحب کہتے رہے۔

"یہ وہ خط ہے جو پہلی جنگ عظیم میں میرے گرینڈ فادر کی خدمات کے اعتراف کے طور پر وائسرائے کے سیکرٹری صاحب نے لکھا تھا۔ یہ دیکھی آپ نے مہر کاغذ کے رنگ کی؟ یہ EMBOSSED SEAL انگریزوں نے پہلی دفعہ برصغیر میں INTRODUCE کرائی تھی۔ اور اس کے ساتھ یہ مونو گرام بھی انہی کا عطا کردہ ہے....اور یہ ہے وہ گروپ فوٹو جو انگریز ڈپٹی کمشنر کے ساتھ ہے۔ میرے ڈیڈی ڈپٹی کمشنر کے بالکل ساتھ دائیں

جانب بیٹھے ہیں اور میں قالین پر بیٹھا ہوں۔ یہ گروپ فوٹو اسی حویلی کے اسی ڈرائنگ روم کی سیڑھیوں کے سامنے لیا گیا تھا جہاں سے چڑھ کر آپ اوپر تشریف لائے ہیں.....اور یہ ہے وہ بید جو میرے ڈیڈی سے شملے میں خریدا تھا۔ دراصل انہوں نے وہاں گرمیوں کے قیام میں اس طرح کے دو بید خریدے تھے۔ ایک پر موتی اور ہیرے جڑوا کر انگریز کلکٹر جان تھامس کو پیش کیا.... یہ دیکھئے ذرا غور سے دیکھئے' اس پر ۱۹۴۴ء کا سن درج ہے۔ اور یہ ہیں بہت سے خطوط جو انگریز افسروں نے وقتاً فوقتاً ہمارے ہاں دعوت کھانے کے بعد شکریے کے طور پر لکھے۔ ان میں سے بعض خطوط پر تو ان کے سیکرٹریوں کی بجائے خود انگریز افسروں کے دستخط ہیں۔ یہ بڑے RARE ہیں اور ان کی بڑی VALUE HISTORICAL ہے۔ "?Don't You Think So

"بالکل ملک صاحب' بالکل! اسے کون DENY کر سکتا ہے؟"

اتنے میں یکے بعد دیگرے پرویز اور قدیر اپنی ڈیوٹی سے واپس آگئے۔ پرویز تو اپنے مہمان کو لے کر اپنے بنگلے میں چلا گیا اور قدیر ملک صاحب کے پاس بیٹھ گیا۔ ملک صاحب تاریخی کھنڈرات سمیٹنے لگے اور قدیر حیرت سے انہیں دیکھتا رہا کہ ڈیڈی نے عمر بھر کا یہ مشغلہ اب بھی ترک نہیں کیا' یہ اب بھی ہر مہمان کو یہ چیزیں دکھانا ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ ملک صاحب نے چیزیں سنبھال کر کہا۔

"ہاں تو قدیر میاں! میں تو دو تین دن سے انڈسٹریل ایریا کی طرف آ نہیں سکا۔ کیا حال ہے؟ کیسا کام چل رہا ہے؟ وہ جو ٹیکسٹائل ملز کی طرف نیا ٹرانسفارمر لگوانا تھا اس کا کیا ہوا' اور ہوزری ڈیپارٹمنٹ میں جو فالتو دھاگہ پڑا تھا' وہ سنبھال لیا یا وہیں پڑا پڑا میلا ہو رہا ہے' اور وہ جو خراب وین تھی........"

"ڈیڈی وہ تو سب کچھ ہو رہا ہے اور ہو جائے گا' لیکن وہاں تو نئی گڑبڑ شروع ہو گئی ہے۔" "وہ کیا؟"

"لیبر بے قابو ہو رہی ہے۔ نہ وقت پر آتی ہے' نہ کام کرتی ہے۔ ذرا ڈانٹو تو ہڑتال کر دیتی ہے۔ آج تو وہ نعرے لگاتے ہوئے میرے دفتر کے باہر آگئے۔ ان کا انداز

AGGRESSIVE تھا۔ یوں لگتا تھا ابھی میرے دفتر کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو جائیں گے"

"تم نے پہلے کبھی ذکر نہیں کیا"

"مجھے کچھ عرصے سے ان کے تیور بدلے بدلے لگتے تھے' پروڈکشن بھی نیچے جا رہی تھی........."

"تو مجھے بتاتے"

"آپ خود بیمار رہتے ہیں آپ کا بلڈپریشر پہلے ہی دو سو سے اوپر جا چکا ہے۔ آپ کو سو دفعہ کہا تھا کہ آپ یہ سب کچھ ہم پر چھوڑ کر بیرون ملک چلے جایئے' اپنا علاج کروایئے' سوئٹزرلینڈ یا اپنی پسند کے کسی ملک میں جا کر آرام کیجئے' جب ٹھیک ہو جائیں تو واپس آجایئے' ہم آپ کا ہر طرح خیال رکھیں گے۔ لیکن آپ حویلی' فیکٹری اور زمینوں کے معاملات کو اتنی ترجیح دیتے ہیں کہ اپنی صحت کا بھی خیال نہیں رکھتے........."

"میری صحت کی فکر نہ کرو تم' میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم بتاؤ ہوا کیا' وہ چاہتے کیا ہیں؟"

"ہونا کیا تھا' بس بات بات پر ہڑتال' بات بات پر نعرے!"

"کہتے کیا ہیں؟"

"پہلے کہتے تھے ہماری تنخواہیں بڑھاؤ' پھر کہنے لگے سال میں کم از کم دو بونس دو اب کہتے ہیں ہمیں فیکٹری میں حصہ دار بناؤ.........اگر آپ ان کے مطالبات مان لیتے تو شاید یہ نوبت نہ آتی۔ اب تو وہ گلے کو آنے لگے ہیں۔"

یہ باتیں سن کر ملک جابر علی کے اندر کا ڈرپوک اور خود زدہ جابر علی بھی کانپ گیا کیونکہ اسے گاؤں سے اٹھتی ہوئی گھٹا بھی نظر آ رہی تھی اور فیکٹری سے اٹھنے والا طوفان بھی۔ لیکن اس نے اپنے اس رد عمل کو چھپا لیا اور بہادر اور غالب جابر علی بن کر کہا۔

"تم فکر مت کرو' میں سب ٹھیک کر دوں گا۔ یہ ٹکے ٹکے کے مزور اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں! غلطی ہماری ہے کہ ہم نے انہیں فیکٹری میں نوکری دی۔ اگر پہلے کی طرح

دو دو کنال بارانی زمین پر رہتے تو دانے دانے کو ترستے رہتے' ہم نے ان پر ترس کھایا' ان کا پیٹ بھرا' انہیں بھوک سے نجات دلائی اور آج یہ ہماری بلی ہمیں ہی میاؤں کرنے لگی ہے........"

"ڈیڈی' اس معاملے کو ذرا TACTFULLY ہینڈل کرنا پڑے گا ورنہ نقصان کا اندیشہ ہے وہ تو مشینیں تباہ کرنے کے درپے ہیں۔"

"انکی یہ ہمت نہیں ہو سکتی۔ میرے پاس اتنے ہتھیار اور اتنی مین پاور ہے کہ میں ایسے تحزیب کاروں کو ایک گھنٹے کے اندر اندر بھون کر رکھ دوں۔ پھر ایس۔ پی صاحب میرے ذاتی دوست ہیں' ڈی آئی جی (پولیس) سے بھی مراسم ہیں۔ انہیں اطلاع کردوں گا تو وہ سبھی کو باندھ کر لے جائیں گے۔ یہ سمجھتے کیا ہیں اپنے آپ کو! انہوں نے ابھی تک ملک جابر علی کے لطف و کرم کو دیکھا ہے' اب وہ اس کے غیظ و غضب کو دیکھیں گے تو اپنی آئندہ نسلوں کو بھی بتا جائیں گے کہ کبھی ملک جابر علی اور اس کی اولاد سے ٹکر نہ لینا.........تم فکر مت کرو قدیر' میں سب کچھ ٹھیک کر دوں گا۔"

اگرچہ ملک جابر علی ہر لحاظ سے بوڑھے ہو چکے تھے لیکن وہ سوتے چھوٹی بیگم ہی کے ساتھ تھے۔ ایک تو شاید انہیں عذرا کے نسبتاً جوان جسم سے اب حرارت ملتی تھی اور دوسرے انہیں وہ مسہری دل و جان سے پسند تھی جو انہوں نے دوسری شادی کے فوراً بعد پیرس سے بنوائی تھی۔ یہ مسہری اگرچہ ہر لحاظ سے جدید وضع کی تھی لیکن انہوں نے اس کے چاروں پائے اتنے بلند رکھوائے تھے کہ ان کے اوپر کسی وقت بھی پھولوں کی چادر ڈال کر بستر عروسی کی شکل دی جا سکتی تھی۔ اس کے چاروں کونوں میں عذرا کے جسم کے ماڈل کی چار حسیناؤں کے نیوڈ ماڈل نصب تھے۔ اب نہ عذرا کا وہ ماڈل رہا تھا اور نہ ان نیوڈز کی پرانی آبا و تاب باقی تھی لیکن ترتیب وہی ہنی مون کے دو ر والی تھی۔ یہ مسہری پیرس سے خوبصورت بکس میں بند ہو کر بحری جہاز کے ذریعے پاکستان پہنچی تھی اور جب سے اس بیڈ روم میں نصب کروائی گئی تھی' عذرا کی ذاتی خادمہ کے سوا

کسی شخص کو بھی اس کمرے میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔
مسہری کے عین اوپر اٹلی کا بنا ہوا فانوس لٹکا ہوا تھا جس میں ایک سو پچاس چھوٹے چھوٹے بلب لگے ہوئے تھے۔ اب کی ساخت عام بلبوں سے مختلف تھی۔ وہ گولی جیسی وضع کے تھے جو عموماً شادی بیاہ کے موقع پر سینکڑوں کی تعداد میں بجلی کی تاروں میں پروئے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی کوالٹی بازاری بلبوں کی نسبت بڑھیا تھی۔ فانوس کے نچلے حصے میں سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا اور اس کی ایک نوک عین مسہری کے اوپر لٹک رہی تھی۔ حسب معمول دیواروں کو خوبصورت ٹیپسٹری (TAPESTARY) اور دروازوں پر دیدہ زیب پردے لٹکے ہوئے تھے اور ایک چھوٹا فرج' ٹیلی ویژن سیٹ اور زیبائش کا ضروری سامان کمرے میں موجود تھا۔ البتہ پچھلے چند برسوں میں ایک چیز کا اضافہ ہو گیا تھا' وہ یہ کہ ملک صاحب کے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر دوائیوں کی بہت سی چھوٹی چھوٹی شیشیاں جمع ہو گئی تھیں جن میں بلڈ پریشر کنٹرول کرنیوالی اور نیند لانے والی گولیوں کی بہتات تھی۔
حسب عادت کوئی گیارہ بجے شب ملک صاحب عذرا کے پہلو میں لیٹ گئے۔ بلجنیم کی نرم فوم کے دو ہلکے تکیے عذرا کے سر کے نیچے تھے اور دو نسبتاً بڑے تکیے ملک صاحب کے سرہانے! ان دونوں نے الگ الگ کریم کلر کی چادر اپنے اوپر ڈال رکھی تھی اب رومان ان کی زندگی سے خارج ہو چکا تھا اور عموماً وہ اکٹھے لیٹ کر دنیاداری کی باتیں کرتے رہتے تھے اب رومان ان کی زندگی سے خارج ہو چکا تھا اور عموماً وہ اکٹھے لیٹ کر دنیا داری کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ عذرا عموماً ذکیہ' اس کی خادمہ اور اس کی بہوؤں کی باتیں کرتی تھی یا نوکروں اور مزارعوں کی بیویوں کے جھگڑے بیان کرتی رہتی تھی جب کہ ملک صاحب فی ایکڑ پیداوار بڑھانے اور انڈسٹریل ایریا کو وسعت دینے کے منصوبوں کا ذکر فرماتے تھے۔ جس رات کا میں ذکر کر رہا ہوں اس رات ملک صاحب کے ذہن میں گاؤں اور فیکٹری میں اٹھنے والے طوفان کا تصور بہت غالب تھا ان کے اندر کا چھوٹا سا خوف زدہ جابر علی آنے والے زلزلے کے خوف سے اندر ہی اندر کانپ رہا تھا۔ کوئی گھنٹہ پون گھنٹہ باتیں کرنے کے بعد عذرا نے پہلو بدلا اور ملک صاحب کی طرف پیٹھ

کر کے سو گئی۔ ملک صاحب نے دو خواب آور گولیاں لیں لیکن اس کے باوجود سو نہ سکے۔ دونوں نے ایک ایک خواب دیکھا' عذرا نے سوتے ہوئے اور ملک صاحب نے جاگتے ہوئے!

عذرا کا خواب بہت ڈراؤنا تھا اس نے دیکھا کہ ملک صاحب عین عالم شباب میں مشکی گھوڑے پر سوار ہیں' انہوں نے گھٹنوں تک لمبے کالے بوٹ' براؤن برجس' چیک کوٹ اور ہنٹنگ کیپ پہن رکھی ہے ساتھ چار پانچ مزارعے رائفلیں اور کارتوس اٹھائے پیدل چل رہے ہیں' ایک ملازم نے لمبی سی لاٹھی کے ساتھ سات مرغابیاں اور تین چار تیتر لٹکا رکھے ہیں اور ملک صاحب اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے' گھوڑے کی باگیں تھامے' شکار گاہ سے واپس آ رہے ہیں لیکن حویلی کے گیٹ کے باہر اچانک گھوڑے کی پیٹھ پر سے گر پڑتے ہیں۔ خالی پیٹھ گھوڑا بھاگ جاتا ہے۔ گدھ اور کوے ملک صاحب کی لاش کو نوچنے لگتے ہیں اور مزارعے بے تعلق کھڑے چپ چاپ سارا منظر دیکھ رہے ہیں۔

ملک صاحب جاگتے میں یہ خواب دیکھ رہے تھے کہ گاؤں سے یلغار اٹھ سکتی ہے' فیکٹری میں گڑ بڑ ہو سکتی ہے اور اگر گاؤں والوں اور فیکٹری والوں نے مل کر بیک وقت ہنگامہ کر دیا تو آیا وہ اس کا تدارک کر سکیں گے؟ آیا وہ ایس پی اور ڈی آئی جی (پولیس کو اطلاع بھی کر سکیں گے؟ اور اگر انہیں اطلاع ہو بھی گئی تو کیا وہ واقعی بر وقت پہنچ کر صورت حال سنبھال لیں گے؟ جب یہ خدشات ملک صاحب کے دل میں گردش کر رہے تھے تو ان کی آنکھیں بے دھیانی میں فانوس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے ایک سو پچاس گولی جیسے بلب جل رہے تھے ملک صاحب کی نظر فانوس کے نچلے حصے میں سنہری نوک پر مرکوز ہو گئی جوان کے سینے کے عین اوپر لٹک رہی تھی۔ اچانک انہیں فانوس ہلتا ہوا دکھائی دیا حالانکہ خوشگوار موسم کی وجہ سے نہ پنکھا چل رہا تھا اور نہ ائیر کنڈیشنر آن تھا لیکن ملک صاحب کو یوں محسوس ہوا کہ فانوس نہ صرف ہل رہا ہے بلکہ چکر کھا رہا ہے اور اس کی سنہری نوک گر کر نیزے کی انی کی طرف ان کی چھاتی میں

پیوست ہونا چاہتی ہے۔ انہوں نے اپنے ہوش و حواس درست کیے۔ جھک کر ساتھ ہی پڑے ہوئے فرج سے ٹھنڈا پانی پیا اور پھر فانوس کی طرف دیکھا تو وہ پھر انہیں گردش میں نظر آیا۔ ان کا جی چاہا کہ وہ عذرا کو جگا دیں لیکن اپنی بہادری کا خول برقرار رکھنے کے لئے ایسا کرنے سے گریز کیا۔ اتنے میں فانوس کا ایک بلب بجلی کی عام تمازت کی وجہ سے اچانک چیخ گیا۔ "پٹاخ" بس ایک ہی آواز آئی' اور یہ آواز ایسی تیز بھی نہ تھی لیکن رات کی خاموشی اور خوف اور ہراس کی اس ذہنی کیفیت میں ملک صاحب کے دل پر اس کا اثر ایک گولی کی آواز کی طرح ہوا اور بیساختہ ان کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ عذرا جو خود ایک ڈراؤنے خواب کی گرفت میں تھی' چونک کر اٹھ بیٹھی۔

"کیا ہوا ملک صاحب؟" ملک صاحب کا اپنا رنگ فق ہو چکا تھا لیکن انہوں نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل سے گلاس اٹھا کر بچا ہوا پانی حلق میں ڈالا اور کہا "کچھ نہیں ہوا' کچھ نہیں ہوا۔"

"کیا آپ نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا؟"

"نہیں۔"

مجھے گولی چلنے اور کسی کے چیخنے کی آواز سنائی دی تھی۔"

یہ سب تمہارا وہم ہے۔ کچھ نہیں ہوا' تم سو جاؤ!"

"لیکن آپ نہیں سوئے۔ کیا آپ نے خواب آور گولیاں نہیں کھائیں آج۔"

"کھائی تھیں۔"

پھر؟"

پھر' پھر......... کچھ بھی نہیں۔"

عذرا بیگم اپنے بستر سے اٹھیں' اپنے بال سیدھے کئے' چائنا شنگھائی کا گاؤن لپیٹا اور مسہری کی پائنتی سے گھوم کر......... نیوڈ ماڈلز کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے' ملک صاحب کی طرف آئی۔ ان کے بیڈ کے پاس رکھا ہوا چھوٹا سر فرج کھولا۔ اس میں سے ایک گلاس پانی لیا اور چار خواب آور گولیاں نکالیں اور ملک کے اوپر جھک کر کہنے لگیں۔

"آپ یہ گولیاں لے لیجئے' سکون سے سو جائیں گے۔"
"نہیں' مجھے ان کی ضرورت نہیں۔"
میں جانتی ہوں کہ ان کی ضرورت ہے' آپ میری بات تو مان جایا کرتے تھے' آج

کیا ہو گیا؟ لے لیجئے نا!"
"لیکن یہ تو بہت زیادہ ہیں' زیادہ خواب آور گولیاں نقصان دہ ہوتی ہیں۔"
"آپ کی بیگم ذکیہ روزانہ چار گولیاں کھا کر سوتی ہے' اسے کچھ بھی نہیں ہوا۔ لیجئے'
اٹھئے میں آپ کو کھلاتی ہوں۔"
اس کے بعد ملک صاحب اٹھ بیٹھے تکیوں سے ٹیک لگا کر گولیاں عذرا سے لیں' پھینکنے
کے انداز میں چاروں گولیاں بیک وقت منہ میں ڈال لیں' عذرا نے گلاس ان کے ہونٹوں
کے ساتھ لگانے کی کوشش کی لیکن انہوں گلاس اس کے ہاتھ سے لے لیا اور دو گھونٹ
پانی کے ساتھ چاروں گولیاں نگل لیں۔
عذرا دوبارہ سو گئی لیکن ملک صاحب کو پھر بھی نیند نہ آئی' وہ ساری رات پہلو بدلتے رہے
حتیٰ کہ صبح ہو گئی۔
صبح کو حویلی والوں سے رات کا واقعہ چھپانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ عذرا نے
ملک صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ کمرے ہی میں آرام کریں لیکن انہوں نے کہا کہ
میرے کمرے میں لیٹنے سے حویلی کے اندر اور حویلی کے باہر یہ تاثر ملے گا کہ میں
خدا نخواستہ غیر موثر یا بیمار ہو گیا ہوں۔ جس دن یہ تاثر پیدا ہو گیا' اس دن نہ صرف
گاؤں اور فیکٹری والے چڑھائی کر دیں گے بلکہ حویلی والوں کی آنکھیں بھی بدل جائیں
گی۔ اس لئے مجھے حسب معمول تیار ہو کر باہر نکلنا چاہیے بلکہ گھوڑی یا جیپ پر بیٹھ
کر شکار کے لئے جانا چاہیے تاکہ کسی کو کوئی غلط تاثر نہ ملے۔
عذرا نے کہا۔ "آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ گولی ماریں تاثر واثر کو' آپ آرام
کریں۔ کیا اور لوگ بیمار نہیں ہوا کرتے؟"

"اور لوگوں اور ملک جابر علی میں بڑا فرق ہے' عذرا بیگم! میری ذات اور صحت سے نہ صرف اس حویلی اور پورے شانتی نگر کا مستقبل وابستہ ہے بلکہ ایک روایت' ایک ماضی اور ایک عظمت میرے دم سے قائم ہے۔ اگر میں کمزور پڑ گیا تو یہ روایت کمزور پڑ جائے گی' اگر میں بیٹھ گیا تو یہ عظمت بیٹھ جائے گی۔ تم کسی نوکر سے کہو کہ سفید گھوڑی تیار کرے۔ میں اپنی پرانی شکار گاہ میں شکار کھیلنے جاؤں گا۔ اسی آب و تاب کے ساتھ' اسی طرح مزارعوں اور نوکروں کے ہمراہ' اسی طرح کتوں اور رائفلوں سمیت......
تم انہیں تیاری کا حکم دو' میں شیو کرکے اور کپڑے بدل کر آتا ہوں۔"

عذرا باہر آ گئی اور ملک صاحب باتھ روم میں چلے گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ تیار ہو کر نکلے۔ انہوں نے برجس پہن رکھی تھی' پاؤں میں لمبے بوٹ اوپر چمڑے والا چیک کوٹ اور ہنٹنگ کیپ! اب یہ کپڑے ان کے بوڑھے جسم پر ڈھیلے اور کھلے کھلے لگ رہے تھے' پاؤں میں بھی پہلے والی چستی نہ تھی' چال بھی کمزور تھی لیکن ملک جابر علی اپنے پرانے رنگ میں نظارہ دینے کے درپے تھے۔ انہیں دیکھ کر کسی کو اتنی جرات نہ ہوئی کہ وہ ڈھیلے کپڑوں یا کمزور جسم کا ذکر کر سکے۔ سب چپ چاپ یہ نظارہ دیکھتے رہے' البتہ اپنے بیڈ روم کے باہر سیڑھیوں پر کھڑی عذرا کا دل ڈوب رہا تھا' کہیں اس کا رات والا ڈراؤنا خواب درست نہ ہو جائے۔ وہ دل ہی دل میں کلمہ پڑھ کر دور سے ملک صاحب کی طرف پھونکتی رہی۔

گھوڑی' کتے اور ملازم تیار تھے ایک ملازم نے کاٹھی کا پیڈل تھام رکھا تھا تاکہ جب دوسری طرف ملک صاحب سوار ہونے لگیں تو کاٹھی الٹنے نہ پائے۔ ابھی وہ سوار نہیں ہوئے تھے کہ ان کی نظر شعیب پر پڑی جسے دو نوکر جیپ کی اگلی سیٹ پر بٹھانے کے بعد اس کی بیساکھیاں جیپ کے اندر رکھ رہے تھے۔

"کہاں کی تیاری ہے شعیب میاں؟" ملک صاحب نے کہا۔

"تھوڑی دیر کے لئے ٹیوب ویل پر جاؤں گا اور پھر بابا چپ شاہ کے مزار پر۔" شعیب

نے جواب دیا۔
ملک صاحب نے زندگی میں پہلی دفعہ کہا۔
"ہمارے لئے بھی دعا کرنا!"
"بالکل ڈیڈی' بالکل!"
اس مختصر سی گفتگو کے بعد ملک صاحب شکار کے لئے روانہ ہو گئے اور شعیب اپنی منزل کی طرف چلا گیا۔

جب ملک صاحب دریا کے پار شکار گاہ میں پہنچے تو وہاں محکمہ جنگلات والوں نے جنگلی گھاس جلانے کے لئے آگ لگا رکھی تھی جو کبھی دھوئیں کی آڑ میں چپکے چپکے آگے بڑھتی اور کبھی ہوا کے جھونکے کے ساتھ تڑتڑ شعلوں کی شکل اختیار کر لیتی۔ ملک صاحب نے حسب معمول آگ سے دور جنگل کی طرف اپنے نوکر بھیج دیئے تا کہ وہ شکار اٹھائیں۔ ایک ملازم کو گولیوں کے پٹے سمیت کوئی بیس قدم پیچھے رکھا اور خود دو کارتوس دو نالی بندوق میں بھر کر جھاڑیوں کے جھنڈ میں جھک کر پیدل چلنے لگے تا کہ چھپا ہوا شکار انہیں دیکھ کر بھاگ نہ جائے۔ وہ قدم پھونک پھونک کر رکھ رہے تھے اور ان کی بندوق آگے کی طرف تنی ہوئی تھی۔ ایک جگہ شکار کا شائبہ پاتے ہی وہ جھاڑیوں کی اوٹ میں دبک گئے ان کے پیچھے پھتہ نوکر بھی اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا۔ پانچ دس منٹ مکمل خاموشی طاری رہی۔ اتنے میں پھیلتی ہوئی آگ ذرا آگے آ گئی جہاں بہت سے جنگلی ناڑ اگے ہوئے تھے ان میں سے اکثر کے تنے خشک تھے اور اوپر دو چار پتے سبز تھے جونہی آگ ان ناڑوں میں داخل ہوئی تو وہ یک لخت پٹاخ پٹاخ کر کے پھٹ پڑے۔ ملک صاحب جن کی توجہ مکمل طور پر شکار کی طرف تھی' پیچھے سے "فائر" کی اچانک آواز سن کر لرز گئے۔ ان کا رنگ فق ہو گیا اور حلق سوکھ گیا۔ لمحے بھر کو انہیں وہم ہوا کہ شاید پھتے نے پیچھے سے ان پر گولی چلا دی ہے لیکن یہ سوچ کر کہ اس کے پاس تو صرف گولیاں ہیں بندوق تو ان کے اپنے ہاتھ میں ہے' وہ اپنی حماقت پر مسکرا دیئے۔ اٹھ کر آواز دی۔ اوئے پھتو! کہاں مر گئے تم؟" اچانک پھتو بھی کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا ہو

گیا اور ملک صاحب کا اشارہ پاتے ہی ان کے پاس پہنچ گیا۔ ملک صاحب نے کہا "تم ادھر ہمارے ساتھ ساتھ رہو' بس ایک قدم پیچھے' زیادہ دور نہیں۔ جونہی شکار اٹھے گا' میں گولی چلاؤں گا اور تم بھاگ کر شکار اٹھا لینا.... سمجھے!"

"جی حضور' جی ملک صاحب!" پھر وہ آگے بڑھنے لگے' کبھی رکتے اور کبھی تیز چلتے رہے حتی کہ ملک صاحب تھک گئے۔ پیچھے سے کرما گھوڑی لے کر حاضر ہو گیا اور ملک صاحب سے استدعا کی کہ وہ گھوری پر سوار ہو جائیں۔ گیارہ بجنے والے ہیں' اب واپس چلنا چاہیے۔

ملک صاحب نے کہا۔ "لیکن ہم آج تک خالی ہاتھ کبھی واپس نہیں گئے۔" "پیچھے دریا میں مرغیاں بہت ہیں حضور' یہاں تو محکمہ جنگلات والوں نے آگ لگا کر سارا شکار بھگا دیا ہے۔"

ملک صاحب کی سمجھ میں بات آگئی۔ وہ سفید گھوڑی پر بیٹھ کر واپس چل پڑے۔ دریا کے مغربی کنارے پر (اپنے مربعوں کے مشرقی جانب) گھوڑی کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے مرغابیوں کی ایک ڈار پر فائر کیا۔ ایک مرغابی پھڑپھڑا کر ڈھیر ہو گئی' باقی اڑ گئیں۔ دو تین پرندے ملازموں نے مار رکھے تھے'انہیں بھی ملک صاحب کے کھاتے میں ڈالتے ہوئے لاٹھی کے ساتھ لٹکا دیا گیا' اور ملک صاحب فاتحانہ انداز میں کامیاب شکار سمیت واپس حویلی میں داخل ہوگئے۔

عذرا نے انہیں بخیر و عافیت اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔ اس کا رات والا ڈراؤنا خواب خدا خدا کرکے غلط ثابت ہوا۔

اس روز ملک صاحب نہ مربعوں پر گئے اور نہ فیکٹری ایریا میں واپس آکر غسل کیا' جوس پیا۔ بلڈ پریشر کنٹرول کرنے والی گولیاں لیں اور لنچ کھا کر لیٹ گئے۔

ملک جابر علی اور ضمیر کے درمیان مواصلاتی رابطہ تقریباً منقطع ہو چکا تھا۔ اگرچہ وہ ایک ہی حویلی کے اندر رہتے تھے لیکن ان کی دنیائیں بالکل الگ تھیں۔ ضمیر کتابیں پڑھتا' پائپ پیتا اور سوچتا رہتا۔ باہر نکلنے کو جی چاہتا تو گاؤں کا چکر لگا لیتا' شہر چلا جاتا یا بابا

بہشتی کے ڈیرے کا رخ کرتا۔ اس کے دل میں ملک صاحب کے لئے کوئی گہری عزت و تکریم نہ تھی' وہ بس یہ سمجھتا تھا کہ ایک تاریخی حادثے کے طور پر ملک صاحب جاگیردارانہ نظام کے نمائندہ بن گئے اور یہ بوسیدہ نظام میں بوس ہونے تک وہ اسی پنجر سے چمٹے رہیں گے۔ اس کے برعکس ملک صاحب کا ضمیر کے متعلق یہ خیال تھا کہ ہر کھاتے پیتے گھرانے میں کوئی نہ کوئی نالائق فرد پیدا ہو ہی جاتا ہے' اور ان کے حصے میں ضمیر آیا ہے جسے جائیداد سے عاق کرنا بے سود اور اس ضمن میں اخباروں میں اشتہار دینا بے عزتی کا باعث ہوگا' اس لئے اسے برداشت کرتے جاؤ۔ اسے خاموش رکھنے کے لیے اس کے حصے کی ہڈی اس کے منہ میں دیتے رہو' اس سے کسی نیکی یا مدد کی توقع نہ رکھو۔ بس یہی غنیمت ہے کہ اس نے ڈاکے ڈالنے اور دوسروں کی بہو بیٹیاں اٹھانے کی طرف رخ نہیں کیا ورنہ روز گلے آتے' روز پولیس دروازے پر ہوتی' روز اخباروں میں خبریں چھپتیں اور روز رسوائی ہوتی۔ یوں ملک صاحب اور ضمیر بقائے باہمی کے اصول پر کاربند تھے۔

آج جب ملک صاحب شکار سے واپس آکر کہیں نہ گئے تو ضمیر سمجھا کہ وہ فارغ ہیں۔ ان کے ایک دوسرے کے متعلق کیسے ہی خیالات سہی' یہ اس کا اخلاقی فرض بنتا ہے کہ وہ کم از کم گاؤں سے اٹھنے والے ممکنہ سیلاب سے انہیں باخبر کر دے۔ اخر وہ بھی اسی حویلی میں رہتا ہے' اس کی چار دیواری اسے بھی تحفظ دیتی ہے۔ اس پر کوئی افتاد آن پڑی تو وہ اپنے حصے کی تباہی تو برداشت کر لے گا لیکن اس حویلی کا کیا بنے گا؟

پچھلے پہر جب ملک صاحب سہ پہر کی چائے کے لیے نکلے اور باہر نوکروں نے پانی چھڑک کر کرسیاں اور فرشی پنکھے لگا دیئے تو ضمیر نے اپنا ذاتی ملازم ملک صاحب کے پاس بھیجا کہ وہ ان سے ملنا چاہتا ہے ملک صاحب نے جوابی پیغام بھجوایا کہ وہ چائے پر آجائے۔

ملک صاحب کا چہرہ رتا لال ہو رہا تھا۔ کچھ تو ان کا رنگ ویسے ہی گورا تھا' کچھ بلڈ پریشر اور دوپہر کے آرام کے بعد اس میں غیر معمولی سرخی آ گئی تھی۔ قبل دوپہر جب

وہ شکار سے واپس آئے تھے تو ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں' ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوئی تھی اور ان کا سانس اکھڑ اکھڑا تھا۔ اب وہ بالکل نارمل لگ رہے تھے۔ انہوں نے نہا دھو کر سفید شلوار کرتہ پہن رکھا تھا جس میں سے ان کی نصف بازو والی بنیان نظر آرہی تھی۔ چھاتی والی جیب میں سنہری زنجیر والی جیبی گھڑی رکھی تھی اور زنجیر کا ایک حصہ سفید قمیض کے درمیانے بٹن کے سوراخ میں ٹنگا ہوا تھا۔ ضمیر معمولی ٹمیالے رنگ کے شلوار کرتے کے اوپر ٹمیالے رنگ کی چادر اوڑھے ہوئے تھا' بکل کے طور پر نہیں' اس کے اپنے انداز میں یعنی چادر کا ایک پلا بغل کے نیچے سے اور دوسرا کندھے کے اوپر سے! آج وہ تعظیماً پائپ اور تمباکو کا ڈبہ اپنے ساتھ نہیں لایا تھا۔

وہ سلام کرکے ملک صاحب کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ملک صاحب نے پوچھا "چائے پیو گے؟"

"جی پی لوں گا۔"

اس پر ملک صاحب نے ساتھ کھڑے ملازم کو چائے بنانے کے لیے کہا۔ جب تک وہ چائے بناتا رہا' باپ بیٹا آمنے سامنے خاموش بیٹھے رہے۔ وہ چائے بنا چکا تو ملک صاحب نے ملازم کو جانے کا اشارہ کیا اور ضمیر سے کہا۔

"ہاں' آج تم نے اہتمام سے APPOINTMENT مانگی تھی' کیا کوئی خاص بات ہے؟"

"جی ہاں' خاص بات ہی تھی ورنہ میں آپ کے معمولات میں مخل نہ ہوتا۔"

"کیا بات ہے؟"

"میں آپ یہ بتانا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں کہ گاؤں والوں کو آپ سے بہت سی شکایتیں ہیں۔"

ملک صاحب نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"کیا شکایتیں ہیں انہیں' اور وہ تم تک کیسے پہنچ گئیں؟"

"بس جی' میں ذرا چلتا پھرتا رہتا ہوں اور آنکھیں کھلی رکھتا ہوں......."

"وہ تو خیر کوئی بھی آنکھیں بند کر کے نہیں چلتا پھرتا! تم بتاؤ شکایتیں کیا ہیں۔"

"انہیں شکایتیں بہت سی ہیں' لیکن بنیادی شکایت یہ ہے کہ ان کی طرف آپ کا رویہ ٹھیک نہیں' آپ اپنے آپ کو حاکم اور انہیں محکوم سمجھتے ہیں۔"

"اگر یہ شکایت درست بھی مان لی جائے تو اس میں کیا حرج ہے؟ صدیوں سے ایسا ہوتا آیا ہے۔ ان کے آباء و اجداد اور ہمارے آباء و اجداد کے درمیان یہی رشتہ تھا۔ اگر میں نے اس رشتے کو تازہ رکھا ہے تو اس میں شکایت کی کیا بات ہے؟"

"اب حالات بدل گئے ہیں۔ لوگ جاگ اٹھے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو آپ کے برابر سمجھتے ہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے' بارانی زمین کے باجرے پر پلنے والے لوگ حویلی والوں کا مقابلہ کرنے لگے ہیں! دوبئی' سعودی عرب' کویت یا لندن سے چند ٹکے کیا کمانے لگے ہیں' ان کی آنکھوں سے شرم و حیا اور انسانیت ہی غائب ہو گئی ہے۔ ان ملکوں سے کل جب انہیں دھکے دے کر نکال دیا جائے گا تو ان نو دولتیوں کی دولت کا خمار پیشاب کی جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا اور وہ پھر ترسنے لگیں گے دو وقت کی روٹی کو!"

"اول تو ایسا نہیں ہو گا۔ لیکن اصل چیز دولت نہیں' شعور ہے۔ حکومت نے پچھلے پندرہ بیس برس سے جگہ جگہ جو سڑکیں بنوائی ہیں' سکول کھولے ہیں' ہسپتال مہیا کئے ہیں' اس سے لوگ بیدار ہو گئے ہیں اور جو ملک سے باہر چلے گئے ہیں' ان کی تو آنکھیں کھل گئی ہیں۔ ان دونوں باتوں سے ہمارے معاشرے کا سارا تانا بانا بدل گیا ہے۔"

"کچھ نہیں بدلا۔ یہ ویسا ہی ہے اور ویسا ہی رہے گا۔"

"آپ نہ مانیں تو آپ کی مرضی ملک صاحب! لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ آپ اور وہ ایک ہیں' اور وہ آپ سے اپنوں جیسے سلوک کی توقع کرتے ہیں۔"

"اگر اتنا ہی پیچھے جانا ہے تو سبھی لوگ آدم اور حوا کی اولاد ہیں' کیا امریکی اور کیا افریقی' کیا شمالی اور کیا جنوبی' کیا ترقی یافتہ اور کیا ترقی پذیر........"

"لیکن اب تو گورے امریکیوں نے بھی کالے حبشیوں کو تسلیم کر لیا ہے انہیں مساوی انسانی حقوق کا مستحق قرار دیا ہے........"

"جب یہاں بھی امریکہ بنے گا تو دیکھا جائے گا! فی الحال ایسا ہی ہے اور ایسا ہی رہے گا۔"

"بہر حال' آپ کی مرضی! میں تو آپ کو خطرے سے آگاہ........"

"کیا خطرہ! ------- نالائق اولاد! اگر تم وفادار ہوتے اس حویلی کے' تو تم مجھے خطرات سے آگاہ کرنے کی بجائے خطرہ بننے والوں کی سرکوبی کرتے' تحزیب کاروں کا قلع قمع کرتے' انہیں کیفر کردار........"

"ملک صاحب! سرکوبی' قلع قمع اور کیفر کردار جیسے الفاظ جدید لغت سے حذف ہو چکے ہیں۔ دنیا کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہے۔"

"مائی فٹ! ذرا سا بھی خطرہ ابھرے تو میں سارے گاؤں کو بھون کر رکھ دوں۔ انہیں میرے ہتھیاروں اور میری وفادار مین پاور کا اندازہ نہیں' سب کو کچل کر رکھ دوں گا....."

"یہ تو انتہائی صورت حال ہو گی جس میں پتہ نہیں کون کس کو کچل دے گا' میں تو اس خونیں انجام سے قبل کی صورت حال کا ذکر کر رہا ہوں۔"

"انہیں اپنی جگہ پر رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ انہیں دبا کر رکھو.......

Keep them under your thumb and everything will be right

لیکن جونہی انہیں ڈھیل دی' ان کو برابری کا تاثر دیا تو وہ گریبان تک آ پہنچیں گے۔ میں نے اپنے آباء و اجداد سے یہی گر سیکھا ہے اور میرا اپنا بھی یہی تجربہ ہے۔ میں یہی گر پرویز' قدیر اور شعیب کو سکھا رہا ہوں۔ جب تک میرے ان بیٹوں اور ان بیٹوں کے بیٹوں کا رویہ حاکمانہ رہے گا' شانتی نگر میں کوئی چڑیا بھی ان کی اجازت کے بغیر پر نہ مار سکے گی۔"

"لیکن ملک صاحب......."

"لیکن ویکن کچھ نہیں' تم ملک جابر علی کی جائز اولاد ہو۔ تم مارشل ریس سے تعلق رکھتے ہو۔ موٹی موٹی کتابوں اور بری صحبت نے تمہیں بزدل بنا دیا ہے۔ حوصلہ رکھو' کچھ نہیں ہوتا۔ ابھی میں زندہ ہوں' حویلی کی عزت و ناموس کا تحفظ کرنا میرا فرض ہے اور

میں یہ فرض نبھانا اچھی طرح جانتا ہوں .... سمجھے؟"

"میں تو سمجھ گیا ہوں ملک صاحب! کبھی آپ بھی سمجھ جایئے!"

یہ کہہ کر ضمیر اٹھ کھڑا ہوا۔ چائے کی بھری ہوئی پیالی وہیں پڑی پڑی ٹھنڈی ہو گئی۔ ضمیر نے از سر نو چادر بغل سے نکال کر کندھے پر ڈالی اور "خدا حافظ" کہہ کر چل دیا۔ ملک جابر علی پھولے ہوئے نتھنوں اور غضب ناک آنکھوں سے اسے دیکھتے رہ گئے۔

موسم برسات پورے جوبن پر تھا۔ پچھلے پندرہ بیس روز سے بڑی شدید بارشیں ہو رہی تھیں۔ کبھی چھ چھ دن تک پانی برستا رہتا اور کبھی ایک آدھ دن کا وقفہ دیکر بادل برسنے لگتے۔ زمینیں گیلی اور کھیت سر سبز و شاداب تھے۔ غیر کاشت شدہ حصے بھی ہریالی سے سجے ہوئے تھے۔ ملک صاحب کے مربعوں پر تمام کنوئیں اور ٹیوب ویل خاموش تھے ان کی حویلی کے مشرقی جانب ایک ٹیوب ویل پر ان کے تین نوکر پھتہ' قربان اور کرما بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ وہ ٹیوب ویل کے پاس مویشیوں کی ایک کوٹھڑی میں چارپائی بچھا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ پھتہ اور کرما تو چارپائی پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھے تھے جب کہ قربان ان کے سامنے لکڑی کے ایک تختے پر بیٹھا تھا۔ موسم گرما کے باوجود بارشوں کی وجہ سے موسم میں خاصی خنکی آگئی تھی۔ وہ تینوں تپلی اور میلی چادریں اوڑھے ہوئے تھے جو باہر اندر آتے جاتے بھیگ گئی تھیں۔ اس گیلے اور خنک موسم میں حقہ بڑا مزہ دے رہا تھا۔ اس کی گرم ٹوپی کی حرارت تمباکو کے نشے سے بھی سوا تھی۔ وہ باری باری کش لگاتے اور باتیں کرتے جاتے۔ پھتہ جوان تینوں میں عمر رسیدہ تھا اپنی باری پر ایک ہاتھ حقے کی نال پر رکھتا اور دوسرا حرارت بھری ٹوپی کے اردگرد پھیلا دیتا۔ اس سے ہتھیلی بھی گرم رہتی اور گفتگو بھی۔ ان کی گفتگو کا موضوع تازہ بارشیں اور سیلاب کے امکانات تھے۔ کرمے نے حقے کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"یار پھتو! تم تو ہم سب سے پرانے ملازم ہو یہاں تم نے محسوس کیا کہ دریا چند سال

پہلے تک یہاں سے خاصا دور تھا' پچھلے سال اور قریب آگیا۔ اب تو اس ٹیوب ویل کے پاس آگیا ہے! ابھی بارشوں کے دو مہینے باقی ہیں' اگر دریا اسی طرح بڑھتا رہا تو ایک ہی چھل میں حویلی تک پہنچ جائے گا۔"

قربان نے کہا "تجھے کیا فکر ہے' کیا تباہ ہوتا ہے اور کیا بچتا ہے' یہ مالک جانیں اور ان کا کام"

کرما "نہیں بھئی! ان زمینوں میں میرا بھی خون پسینہ شامل ہے۔ پہلے میں ان میں ہل چلاتا' پھر ٹریکٹر آئے تو میں نے ٹریکٹر چلانا سیکھ لیا اور پچھلے چھ سال سے ٹریکٹر چلا رہا ہوں۔ پھر ہم نے خود ان زمینوں کی کمائی کھائی ہے۔"

پھتہ "(تعجب سے) بھئی کرمے! آج بڑی سیانی باتیں کر رہا ہے تو' معلوم ہوتا ہے بارشوں کا تمہارے اوپر بہت اچھا اثر ہوا ہے۔"

پھتہ اور قربان قہقہہ لگا کر ہنسے۔ حقے کی نال کرمے کی طرف پھر گئی' کرما نال مٹھی میں پکڑ کر کش لگائے بغیر سوچنے لگا۔ پھتے نے کہا۔ "کس سوچ میں پڑ گئے ہو؟ ہل تو میں نے بھی چلایا ہے' ٹریکٹر اور ٹیوب ویل پر بھی کام کیا ہے' حویلی میں بھی ڈیوٹی دی ہے لیکن مجھے کوئی فکر نہیں' تجھے کیا سوچ سونگھ گئی ہے' حقہ پی' حقہ۔ ملک صاحب جانیں اور ان کا کام۔"

قربان جو نسبتاً جوان اور دو چار جاعتیں پڑھا ہوا تھا' کہنے لگا۔

"سوچنے کی بات چاچا کرما یہ ہے کہ ملک صاحب جو کچھ بھی ہیں وہ میرے' آپ کے اور چاچا پھتہ کی وجہ سے ہیں۔ اگر ہم اور ہمارے ساتھی ان کی زمینوں پر کام نہ کریں تو ملک صاحب بھی ہماری طرح غریب ہو جائیں۔"

پھتہ نے کہا۔ بالکل جی' بالکل! بلکہ ہم سے بھی غریب ہو جائیں۔ ہم تو پھر کہیں سڑک پر روڑی کوٹ کر روزی کما لیں گے' وہ تو اس کام کے بھی قابل نہیں۔"

کرما اپنی گہری سوچ سے جاگا۔ حقہ' پھتے کی طرف گھمایا اور ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

"اگر دریا اسی طرح مار کرتا رہا تو ان گرمیوں میں نہیں تو اگلی گرمیوں میں اس کا چھل

ضرور حویلی تک پہنچ جائے گا۔"

وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اچانک منشی لال دین اپنی پھندنے والی ٹوپی سمیت وہاں آ نکلا۔ آج نہ تو اس کی بغل میں بڑے بڑے رجسٹر تھے نہ آنکھ پر کمانی دار عینک اور نہ کان میں قلم یا پنسل آج تو وہ عام سا انسان لگتا تھا۔ کرمے' پھتے اور قربان جیسا' اور وہ انہی میں مل کر بیٹھ گیا۔ اس کے اعزاز میں حقے کی ٹوپی الٹ کر اس میں نیا تمباکو بھرا گیا۔ بوری کا ایک پرانا ٹکڑا جلا کر تازہ آگ بنائی گئی اور دو تین ابتدائی کشوں میں حقہ چالو کر کے منشی جی کے ہاتھ میں تھما دیا گیا۔ پھتے نے کہا۔

"منشی جی! کرمے کو یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ دریا کا پاٹ پھیلتا جا رہا ہے' اب تو بالکل ٹیوب ویل کے قریب پہنچ گیا ہے۔ اب سیلاب آیا تو حویلی تک پہنچ جائے گا۔ اور ہم اسے تسلی دے رہے ہیں کہ ملک صاحب بڑے سیانے آدمی ہیں' ضرور کوئی نہ کوئی بندوبست کر رہے ہوں گے۔ کیوں منشی جی' آپ کو کچھ علم ہے؟"

"ہاں ہاں! مجھے سارا علم ہے۔ پچھلے سال تم لوگوں نے یہاں دو لمبے لمبے چٹی چمڑی والے آدمی نہیں دیکھے تھے؟"

چند لمحے حافظے پر زور دیکر کرما اور پھتہ بولے۔ "جی ہاں دیکھے تھے' پتلونیں پہنے کھیتوں میں پھر رہے تھے۔ ملک صاحب ان کے ساتھ ساتھ تھے وہ دو تین دفعہ دریا کی طرف بھی گئے تھے لیکن دریا لبالب بھرا ہوا ہونے کی وجہ سے عبور نہ کر سکے اور پھر ملک صاحب کی جیپ میں بیٹھ کر حویلی کی طرف چلے گئے تھے۔"

"وہ دریا پار کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ امریکی ماہرین تھے جو ملک صاحب نے بڑی دور سے منگوائے تھے جو خطرہ آپ لوگ آج محسوس کر رہے ہیں' کئی سالوں سے ملک صاحب کے ذہن میں ہے۔ انہوں نے پچھلے سے پچھلے سال ہی اس کا حل سوچنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے ان کا خیال تھا کہ آپ لوگوں کی محنت اور ٹریکٹروں کے استعمال سے بابا بہشتی کی کوٹھڑی سے لے کر یہاں تک ایک بند باندھ دیا جائے......"

قربان نے تعجب سے کہا "اتنا لمبا!" اور کرما اور پھتہ بھی حیرت سے منشی جی کا منہ دیکھنے لگے منشی جی نے کہا۔ "اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں، آج کل کے دور میں ہر چیز ممکن ہے۔ بہرحال وہ تجویز ملک صاحب نے پچھلے سال ہی ترک کر دی تھی اور ایک غیر ملکی فرم سے جو بند باندھنے اور دریاؤں کا رخ موڑنے میں شہرت رکھتی ہے، رابطہ قائم کیا جنہوں نے بھاری فیس لے کر اس منصوبے کے لیے ایک FEASIBILITY رپورٹ تیار کرنے کا ذمہ لیا تھا۔"

"منشی جی، امریکنوں کے دورے کے باوجود دریا تو پھر بھی پچھلے سال چڑھ آیا تھا!" قربان نے کہا۔

"صرف دورہ کرنے سے تو چڑھتا ہوا دریا نہیں رکتا، اس کے لیے تو عملی کام کرنا پڑتا ہے۔" منشی جی نے جواب دیا۔

"وہ عملی کام کب ہو گا؟ منشی جی! اس دفعہ تو دریا زیادہ ہی غصے میں نظر آتا ہے۔ آپ باہر نکل کر دیکھیں تو یوں لگتا ہے کہ ابھی اٹھ کر آپ کے گلے پڑ جائے گا اور ہر چیز........" کرمے نے کہا۔

"تم فکر مت کرو، امریکی ماہرین نے رپورٹ تیار کر لی تھی۔ اس کی ایک نقل ملک صاحب کو بھی بھیج دی تھی، ملک صاحب نے ان کے تخمینے کے مطابق رقم خرچ کرنے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔ بات طے ہو گئی تھی۔ انہوں نے اپنے ماہرین اور انجینئر بھیجنے کا وعدہ بھی کر لیا تھا......"

"لیکن وہ آئے تو نہیں!"

"ہاں اسی بات پر میں خود حیران ہوں کہ وہ آئے کیوں نہیں، انہیں تو بہت پہلے آ جانا چاہیے تھا۔"

"کیا پتہ جی، کسی اور نے انہیں ٹھیکے پر بلا لیا ہو!" کرمے نے لقمہ دیا۔

منشی جی نے حقے کا کش لیتے ہوئے ذہن پر زور دیا اور کہا۔ "کرمے، تم ان پڑھ ہونے کے باوجود بعض اوقات بڑی عقل کی باتیں کر جاتے ہو۔"

بیچ میں پھتے نے لقمہ دیا۔ "دراصل بارشوں میں اس کا دماغ بڑا تر ہو جاتا ہے۔ آج صبح ہی سے بڑی سیانی باتیں کر رہا ہے....."

منشی جی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"کرمے کا خیال ٹھیک لگتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ دریا کے اس پار بسنے والوں کو پتہ چل گیا ہو کہ ملک صاحب نے امریکی ماہرین طلب کئے ہیں' یہاں راز تو کوئی رہتا نہیں' اور انہوں نے سوچا ہو کہ اگر ملک صاحب نے امریکیوں کی مدد سے دریا کے اس طرف بند باندھ دیا تو سیلاب کے دنوں میں دریا کا پانی یقیناً دوسری طرف چلا جائے گا اور ادھر تباہی مچا دے گا۔"

پھتہ' کرما اور قربان تینوں منشی جی کی عقل کی داد دینے لگے۔

ایک نے کہا۔ "واقعی جی' واقعی' منشی جی کیا عقل مندی کی بات کی ہے۔"

دوسرا بولا۔ "منشی جی نے دنیا دیکھی ہے' بڑے کام کے آدمی ہیں۔"

تیسرے نے کہا۔ "بس جی' ملک صاحب نے سارے کھاتے ویسے ہی تو ان کے سپرد نہیں کر رکھے' آخر بات ہے نہ کوئی.........ہاں تو منشی جی پھر....؟"

منشی جی نے کہا۔ "مجھے اس بات کی خبر نہیں ہے لیکن ممکن ہے کہ دریا کے مشرق کنارے والوں نے بھی انہی ماہرین کی خدمات حاصل کر لی ہوں اور اب وہ ان کے لیے ویسی ہی FEASIBILITY رپورٹ تیار کر رہے ہوں۔"

"بالکل' بالکل........ ہو سکتا ہے جی!" انہوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

منشی جی نے مزید عقل مندی کا مظاہرہ کرنا ضروری سمجھا اور کہا۔

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ امریکی ماہرین دونوں طرف سے کھا رہے ہوں' ایک جائزہ اس طرف سے دوسرا اس طرف سے' ادھر سے بھی بھاری فیس ادھر سے بھی بھاری فیس! ایک رپورٹ ادھر کے لیے اور دوسری ادھر کے لیے .... دونوں کو...."

پھتہ بیچ میں بول پڑا۔ "بالکل جی' یہ تو دونوں کو تھک' لگانے والی بات ہوئی ناجی۔" منشی نے فوراً تائید کی۔ "بالکل' بالکل!"

کرمے نے کہا۔ "منشی جی' یہ بات جو ہم جیسے ان پڑھ لوگ سوچ سکتے ہیں' ملک صاحب کے دماغ میں کیوں نہ آئی؟"

منشی جی نے کہا "بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔ ممکن ہے جان بوجھ کر یملا جٹ بنے ہوئے ہوں۔ امریکیوں کو ٹیسٹ کر رہے ہوں کہ وہ کتنے قابل اعتبار ہیں' یا کوئی اور مصلحت ہو۔"

"لیکن دریا تو اڈ رہا ہے منشی جی!"

"وہ ٹھیک ہے۔ جو بات آپ لوگ سوچ رہے ہیں' ملک صاحب کی سمجھ میں بہت پہلے آ گئی تھی' انہوں نے امریکیوں کا ٹھیکہ ختم کئے بغیر چین میں بھی ایک چٹھی لکھ دی تھی کہ ہمارا یہ مسئلہ ہے' کیا آپ تکنیکی ماہرین اور مدد گار بھیج سکتے ہیں.........."

"سنا ہے جی چینی زیادہ مخلص اور قابل اعتماد ہوتے ہیں۔"

"بالکل' بالکل یہی وجہ ہے کہ ملک صاحب نے ان کی طرف رجوع کیا۔ چین نے فوراً جواب دیا کہ ہمارے پاس دریاؤں کا رخ موڑنے والے ماہرین موجود ہیں' چنانچہ ملک صاحب نے تار بھیج کر انہیں اطلاع دے دی کہ وہ فوراً تشریف لے آئیں' ایمرجنسی ہے۔"

"پھر؟"

"بس ان کا انتظار ہے آنے ہی والے ہوں گے۔ دراصل انہیں اطلاع بھی تو بڑی دیر سے دی گئی تھی۔"

"لیکن منشی جی' دریا تو ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ آپ کو اس کی شونک سنائی نہیں دے رہی کیا؟

میرے کان بج رہے ہیں یا واقعی دریا چڑھ رہا ہے"

قربان نے باہر نکل کر دیکھا اور فوراً واپس آ کر چلایا۔

"اٹھو' بھاگو' یہاں سے دریا میں طغیانی آ گئی ہے۔ دریا اچھل مار کر کناروں سے باہر آ گیا

ہے۔ اوپر گھرے بادل ہیں، پربت کی طرف سخت بارش ہو رہی ہے۔ دریا کا پانی مزید اٹھے گا اٹھو، نکلو!"

قربان کا واویلا سن کر سبھی باہر نکل آئے اور دریا کے پانی کو کسی پھرتیلے سانپ کی طرح بل کھاتے آگے بڑھتا دیکھ کر حویلی کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے تاکہ ملک صاحب کو فوری خطرے سے آگاہ کر سکیں۔

کالے سیاہ بادل حویلی پر چھائے ہوئے تھے لیکن بارش کچھ وقت کے لیے تھم گئی تھی۔

چڑھتے دریا کی خبر پہلے ہی ملک صاحب تک پہنچ چکی تھی۔ فوری رد عمل کے طور پر ان کا جی چاہا کہ مشکی گھوڑے پر کاٹھی ڈلوائیں ' برجس' لانگ شوز اور ہنٹنگ کیپ پہنیں اور خود دریا کا نظارہ کرنے نکلیں لیکن کیچڑ' بارش اور سیلاب کے پیش نظر...... خصوصاً ان کی صحت کی بنا پر..... گھر والوں نے انہیں حویلی سے نکلنے سے روک دیا۔ ذکیہ بیگم تو خیر ایک مدت سے بستر سے اٹھ نہیں سکتی تھی اور شاید اسے ایمرجنسی کا پوری طرح علم بھی نہ تھا لیکن عذرا نے ملک صاحب کا راستہ روک کر اور زور دے کر کہا۔

"آپ ساری عمر اپنی من مانی کرتے رہے ہیں لیکن آج میں آپ کو ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گی۔ نہ آپ کی صحت اجازت دیتی ہے اور نہ حالات کہ آپ حویلی سے باہر نکلیں' آخر آپ باہر نکل کر کیا کر لیں گے؟"

"میں سنی سنائی باتوں کی بجائے آنے والے سیلاب کا آنکھوں سے نظارہ کرنا چاہتا ہوں' میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ سیلاب کتنی دور ہے' پانی کتنا تیز ہے اور ہمارے پاس کتنا وقت ہے۔ آخر حویلی کو بچانا میرا فرض ہے۔"

"آپ یہ فرض جس طرح چاہیں پورا کریں لیکن میں اس طوفان میں آپ کو کسی قیمت پر باہر نہیں جانے دوں گی۔"

پرویز اور قدیر بھی عذرا کی حمایت کرنے لگے اور وہ سب مل کر ملک صاحب کو گھوڑے پر سوار ہو کر باہر جانے سے روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور ملک صاحب اس بات

پر راضی ہو گئے کہ وہ حویلی کی چھت پر چڑھ کر دریا اور اس کی طغیانی کا نظارہ کریں گے اور پھر اس کے مطابق ضروری ہدایات دیں گے۔ اس پر عذرا' پرویز اور قدیر نے

صاد کر دیا۔

ملک صاحب چھت پر چڑھنے کی بجائے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئے تو انہوں نے اپنا پسندیدہ لباس برجس' لانگ بوٹ اور ہنٹنگ کیپ پہن رکھی تھی۔ ہاتھ میں ان کا پسندیدہ بید تھا جسے وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مار رہے تھے۔ انہیں اس روپ میں دیکھ کر عذرا' پرویز اور قدیر سمجھے کہ شاید وہ گھڑ سواری کے موڈ میں ہیں' لیکن پتہ چلا کہ ملک صاحب نے پچاس فیصد اپنی ضد پوری کر لی ہے اور پچاس فیصد اپنے مشیروں کی بات مان لی ہے یعنی لباس ان کی اپنی پسند کا اور نظارے کی جگہ کا انتخاب گھر والوں کے کہنے کے مطابق!

لہٰذا وہ چاروں حویلی کے خفیہ حصے سے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ ملک صاحب آگے آگے اور عذرا' پرویز اور قدیر پیچھے پیچھے! چھت پر پہنچ کر ملک صاحب مشرق کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے بید دونوں ہاتھوں سے کمر کے پیچھے پکڑ رکھا تھا' ٹانگیں گھڑ سواروں کی طرح پھیلا رکھی تھی' آنکھیں چڑھتے ہوئے دریا کی طرف تھیں اور باقی تینوں افراد ان کے پیچھے خاموش کھڑے تھے۔

دریا واقعی آپے سے باہر ہو چکا تھا۔ وہ ملک صاحب کی زمینوں کو روندتے ہوئے سیدھا حویلی کی مشرقی دیوار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ عذرا' پرویز اور قدیر ملک صاحب کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ملازم اپنے اپنے کوارٹروں میں دبکے بیٹھے تھے۔ ملک صاحب نے اپنی بیوی اور جوان لڑکوں کو پریشان ہوتے دیکھا تو کہنے لگے۔ "حوصلہ رکھو' سب ٹھیک ہو جائے گا! حویلی کو بچانا میرا فرض ہے' میں یہ فرض نبھانا اچھی طرح جانتا ہوں۔ فکر مت کرو" ابھی وہ یہ تسلی آمیز تقریر کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں دریا کی غضبناک لہروں نے حویلی کی مشرقی دیوار پر ایسا ہلا بولا کہ پوری کی پوری دیوار دھڑام سے زمیں بوس

ہو گئی۔ دریا کی طوفانی لہریں دیوار کو روندتی ہوئی حویلی کے اندر داخل ہو گئیں۔ دھڑام کی آواز سن کر عذرا کی چیخ نکل گئی۔ پرویز اور قدیر "اب کیا ہو گا ڈیڈی' اب کیا ہو گا ڈیڈی" کہنے لگے۔

ملک صاحب کا ایک ہی جواب تھا "تم فکر مت کرو۔ میں نے زندگی میں بڑے بڑے طوفان دیکھے ہیں مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ میں طوفانوں کا مقابلہ کر سکوں۔ تم تسلی رکھو۔ صرف ایک دیوار گری ہے' حویلی تو نہیں گری! حویلی کا یہ مرکزی حصہ جس پر ہم کھڑے ہیں' خاصا اونچا ہے۔ اس کی دیواریں مضبوط ہیں' زمین سے پندرہ سیڑھیاں چڑھ کر حویلی کے فرش تک پہنچتے ہیں...... وہ دیکھو دور شمال کی طرف! طغیانی کا زور ٹوٹ رہا ہے' پانی حویلی کے مرکزی حصے تک نہیں پہنچے گا۔ تم فکر نہ کرو!"

ملک صاحب یہ تسلیاں دے رہے تھے کہ قدیر یا پرویز میں سے کوئی بولا۔

"لیکن ڈیڈی' سرونٹ کوارٹر تو بہہ گئے' مزارعوں کے مکان بھی......."

"تم فکر مت کرو' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مزارعے بھی نئے مل جائیں گے اور ان کے مکان بھی دوبارہ بن جائیں گے۔"

اتنے میں پتہ نہیں اس موسم میں بابا بہشتی کہاں سے نکل آیا۔ پانی میں شرابور' پاؤں سے ننگا اور منہ پر ہوائیاں! حویلی کے گیٹ پر کوئی دربان نہ ہونے کی وجہ سے وہ سیدھا حویلی کے مرکزی حصے تک آ پہنچا اور اوپر والی سیڑھی پر کھڑے ہو کر آوازیں دینے لگا۔

"حویلی والو! باہر نکلو' حویلی کو بچاؤ۔ پرویز' قدیر' ضمیر کہاں گئے تم' کدھر ہو تم؟ شعیب' قدیر' ضمیر باہر نکلو۔ گاؤں والوں کو بلاؤ' انہیں اپنے ساتھ ملاؤ' سب مل کر طوفان کا مقابلہ کرو' یہ حویلی سب کی ہے' یہ شانتی نگر سب کا ہے!"

اس کے واویلے پر کسی نے توجہ نہ دی بلکہ اسے اس حالت میں شور مچاتے دیکھ کر عذرا' پرویز اور قدیر نے ناک بھوں چڑھائی اور اسے وہاں سے چلے جانے کو کہا۔ وہ پھر بھی

باز نہ آیا اور ان کے احتجاج کے باوجود کہتا رہا۔ "باہر نکلو' حویلی کو بچاؤ' گاؤں والوں کو اپنے ساتھ ملاؤ۔"

اس پر ملک صاحب نے غصے سے کہا۔ "کیا بک بک لگا رکھی ہے' جاؤ اپنی جھونپڑی کی فکر کرو۔ حویلی کی دیکھ بھال کرنے والے بہت ہیں۔ جاؤ بھاگو یہاں سے' جو کوئی آتا ہے مشورہ دینے آ جاتا ہے جیسے ہم کچھ جانتے ہی نہیں۔ ہٹو' بھاگو یہاں سے!"

وہ واپس مڑنے ہی والا تھا کہ ضمیر ساتھ والے بنگلے سے نکلا اور بابا بہشتی کو بازو سے تھام کر اندر لے گیا۔ گیلے کپڑوں کے باوجود صوفے پر بٹھایا اور پوچھا۔

"کیوں بابا' تمہاری جھونپڑی کا کیا ہوا...... بہہ گئی؟"

"نہیں بیٹا' وہ تو صحیح سلامت ہے۔"

"کیا دریا نے ادھر مار نہیں کی؟"

"دریاؤں کا رخ تو موڑنے والا اللہ تعالیٰ ہے بیٹا۔ ادھر سب خیریت ہے۔ مجھے اپنی جھونپڑی کی نہیں' حویلی کی فکر ہے۔ دریا کے پھنکارتے پانی کو حویلی کا رخ کرتے دیکھا تو ادھر بھاگ پڑا۔ لیکن دریا کا غصہ مجھ سے تیز نکلا' میرے پہنچنے سے پہلے ہی اس نے حویلی کی مشرقی دیوار گرا دی۔ افسوس مجھے دیر ہو گئی!"

بابا بہشتی اور ضمیر اندر بیٹھے حویلی کے بچاؤ کی باتیں کرتے رہے اور چھت پر ملک صاحب اپنی سوچ میں محو رہے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے کہا۔

"دیکھا عذرا! پانی کا زور ٹوٹ گیا۔ دیکھا پرویز تم نے! پانی کس تیزی سے اتر رہا ہے۔ خواہ مخواہ گھبرا جاتے ہو تم لوگ۔ میں نے کہا تھا نا کچھ نہیں ہوتا حویلی کو' اس کی حفاظت کا ذمہ دار میں ہوں۔ اس پر کوئی آنچ نہیں آ سکتی۔ کیوں قدیر' نوٹ کیا تم نے؟ اگر میں بھی چڑھتے طوفان کو دیکھ کر بوکھلا جاتا تو کیا رہ جاتا ہمارے پلے! سبھی لوگ مذاق اڑاتے' یہی بڈھا جا کر گاؤں والوں کو طرح طرح کے من گھڑت قصے سناتا......"

بارش تھم چکی تھی' طغیانی کا پانی پسپا ہو رہا تھا۔ مگر آسمان پر کالے بادل ابھی تک گرج

رہے تھے۔ اتنے میں گاؤں کے لوگ دریا کا نظارہ کرنے اپنے اپنے گھروں سے نکلے یہ ان کا پرانا معمول تھا۔ موسم برسات خصوصاً طغیانی کے بعد وہ ضرور اس طرف نکل آتے۔ کچھ شوقیہ طور پر اور کچھ لالچ کی خاطر کیونکہ درختوں کے ٹوٹے ہوئے تنے' نیم بے ہوش مویشی یا دوسرا کوئی مال بھی بہہ آتا تھا اور گاؤں والے انہیں پکڑ کر لے آتے تھے۔ جنہیں اس مال میں دلچسپی نہیں ہوتی تھی' وہ ویسے ہی اٹھتی بیٹھتی لہروں کا نظارہ کرنے اس طرف آ نکلتے۔ کئی نوجوان تو لنگوٹ کس کر آتے تھے تاکہ لہروں پر سواری کا مزہ لے سکیں۔ آج جب گاؤں والے باہر نکلے تو انہوں نے حسب عادت ہاتھ میں لمبی لمبی لاٹھیاں اٹھا رکھی تھیں جو درختوں کے بہتے تنوں یا ایندھن کو دریا سے نکالنے یا بہتے مویشیوں کو ہانک کر کنارے پر لانے میں مدد دیتی تھیں۔ وہ بڑے خوش تھے کہ ایک عرصے کے بعد یہ تماشا دیکھنے کو ملا ہے۔ ابھی انہیں اس کی خبر نہ تھی کہ حویلی کی مشرقی دیوار گر چکی ہے اور ملک صاحب کے مربعوں کے تمام کنوئیں اور ٹیوب ویل ڈوب چکے ہیں۔ وہ طغیانی دیکھنے اور اس کے ذریعے کچھ مال حاصل کرنے کے لیے جوق در جوق گاؤں سے نکل آئے تھے۔ ان کی تعداد یہی کوئی سو ڈیڑھ سو افراد ہو گی۔ ان کے کپڑے خشک اور ہاتھوں میں اونچے اونچے لٹھ تھے۔ بعض نے کلہاڑیاں اور خنجر اور ڈنڈے بھی اٹھا رکھے تھے۔

ملک صاحب مشرقی جانب دریائی طوفان سے فارغ ہوئے تو انہوں نے چھت سے اترنے سے پہلے یونہی ایک نگاہ گاؤں کی طرف اٹھائی کہ آیا ادھر بھی طغیانی کا پانی پہنچا ہے یا نہیں۔ وہاں انہوں نے انسانی ہجوم دیکھا' ان کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں اور لمبے لمبے لٹھ دیکھے تو انہیں اصل ایمرجنسی کا احساس ہوا۔ انہیں یوں لگا کہ شانتی نگر سے اٹھنے والے جس طوفان کا وہ ایک عرصے سے ذکر سن رہے تھے' وہ آ گیا ہے۔ انہوں نے اپنے ارد گرد کسی سے بات کئے بغیر غور سے اس ہجوم کو دیکھا۔ پتہ نہیں چند منٹوں میں ان کے ذہن میں ماضی' حال اور مستقبل کے کیا کیا مناظر گھوم گئے کہ وہ وہیں اپنے قدموں

پر کھڑے کھڑے لڑکھڑائے۔ ان کے منہ سے "وہ آ گئے' وہ آ گئے" کے الفاظ نکلے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ برجس' لانگ شوز اور ہنٹنگ کیپ سمیت دھڑام سے گر پڑے۔

عذرا' پرویز اور قدیر نے انہیں سہارا دیا اور اپنے بازوؤں میں اٹھا کر' سیڑھیوں سے نیچے لے گئے۔

حویلی میں کہرام مچ گیا۔ بابا بہشتی "استغفراللہ' استغفراللہ" پڑھتا اپنی جھونپڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔

اور شانتی نگر پر سیاہ بادل چھٹ گئے!